Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1962ء

خدا کا اٹل قانون

ولقد اهلكنا القرون من قبلكم لما ظلموا وجاءتهم رسلهم بالبينٰت وما كانوا ليؤمنوا۔ كذالك نجزى القوم المجرمين۔ ثم جعلنكم خلئف فى الارض من بعدهم لننظر كيف تعملون (۱۰/۱۳-۱۴)۔

تم تاریخی یاد داشتوں کو سامنے لاؤ اور دیکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں ایسی گذر چکی ہیں کہ انہوں نے ظلم اور زیادتی، حق تلفی اور نا انصافی شروع کی۔ خدا کے رسولوں نے انہیں واضح دلائل کے ساتھ بتایا کہ ان کی وہ روش تباہ کن ہے۔ انہوں نے ان کی ایک نہ سنی، اور زیادتیاں کرتے چلے گئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ تباہ و برباد ہوگئے۔ اور یہ بات کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں۔ ہمارا قانون ہی یہ ہے کہ جو قوم بھی اس قسم کے جرائم پر اتر آتی ہے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنایا اور حکومت عطا کی، تاکہ یہ دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟ اگر تم نے بھی وہی کچھ کیا تو تمہارا حشر بھی انہی جیسا ہوگا۔

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر ۷۵۰۰
ہندوپاکستان سے سالانہ آٹھ روپے	ہندوپاکستان سے	خط وکتابت کا پتہ
غیر ممالک سے ۲۰ شلنگ	۷۵ نئے پیسے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۵ — جنوری ۱۹۶۲ء — نمبر ۱

فہرست مضامین

لمعات ———— ۲

دینِ خداوندی کے مخالفین ———— ۹

باب المراسلات ———— ۳۰

احتساب ———— ۳۴

فکرِ اقبال کی نشر و اشاعت ———— ۵۳

رابطہ باہمی ———— ۵۸

نقد و نظر ———— ۶۱

اسبابِ زوالِ امت _ (علامہ اسلم جیراجپوری (مرحوم)) ———— ۶۵

اسلام پر یونانی و رومی تہذیب کے اثرات (محترم علامہ طاسین مصری) ۷۴

بقیہ "لمعات" ———— ۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان صاحب اختیار و ارادہ ہے اور حیوان مجبور ہے صاحب اختیار و ارادہ ہونا' بڑی لذت بخش اور کیف انگیز خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اسے کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا۔ لیکن فطرت کی طرف سے یہ متاعِ گراں بہا مفت نہیں مل گئی۔ اس نے اس کی بڑی قیمت وصول کی ہے۔ اور وہ قیمت ہے ـــــ ذمہ داری ـــــ (responsibility)۔ جتنی زیادہ اختیار کی وسعتیں اتنی بڑی ذمہ داری۔ لیکن جہاں انسان' اختیارات کے استعمال سے بے پناہ لذت حاصل کرتا ہے' وہاں ذمہ داری کا بوجھ اس پر بہت گراں گزرتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہمیشہ کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ سچے یا جھوٹے' حقیقی یا مصنوعی اختیارات کے استعمال سے لذت اندوز اور کیف آشنا تو ہوتا رہے لیکن کسی نہ کسی طرح' ذمہ داریوں کے بوجھ سے بچ جائے۔ نوعِ انسان کی تاریخ کا بیشتر حصہ' اس کی اسی خود فریب کوشش کی داستان ہے۔ اس میں وہ طبقہ بھی شامل ہے جس نے ذہنی یا جسمانی قوت اور برتری حاصل کر کے' ایسے نظریاتِ حیات اور نظامہائے تمدن و معاشرت وضع کئے جن سے ان کی ہوسِ اقتدار کی تو تسکین ہوتی رہے لیکن ان کی چیرہ دستیوں کی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہو۔ اور وہ کمزور اور زیردست طبقہ بھی شامل ہے جو ان تمام چیرہ دستیوں کو محض اپنی کمزوری اور دوں ہمتی کی بنا پر برداشت کرتا اور اس طرح' ان انسانیت سوز نظریات و نظامہائے تمدن و سیاست کی کامیابی کا ذریعہ بنتا رہا' لیکن اپنے اوپر اس کی ذمہ داری لینے سے کتراتا رہا۔ مثلاً

(۱) ذاتوں اور ورنوں کا عقیدہ' خواہ اس کی ابتدا یونان سے ہوئی ہو یا ہندوستان سے' اس کی نمایاں مثال ہے۔

ہم سر دست ہندوستان کو سامنے رکھتے ہیں۔ یہاں لکھے پڑھے لوگوں کی ایک جماعت (برہمنوں) نے ذہنی برتری حاصل کی۔ اور دوسرے طبقہ (کھشتریوں) نے جسمانی قوت فراہم کر لی۔ ان دونوں کے گٹھ جوڑ نے باقی انسانوں کے متعلق فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کی خدمت میں مصروف رہیں۔ اس کے لئے انہوں نے عقیدہ وضع کیا کہ ہر شخص دنیا میں، اپنے سابقہ جنم کے اعمال کے مطابق پیدا ہوتا ہے جس کے اعمال بہت اچھے ہوں، وہ برہمن یا کھشتری کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ برے اعمال والے انسان، ویش یا شودر کے ہاں جنم لیتے ہیں۔ اس لئے، برہمن اور کھشتری کو حق حاصل ہے کہ وہ نیچ ذات کے انسانوں سے خدمت لے۔ اور نیچ ذات کے انسان پیدا ہی اس لئے کئے جاتے ہیں کہ وہ اونچے ورن کے انسانوں کی خدمت کریں۔ دنیا کی ہر دولت اور قوت اور سامان عیش و عشرت اونچے ورن والوں کا حصہ ہے۔ نکبت و زبوں حالی۔ افلاس و ناداری۔ بھوک اور بیماری۔ نیچ ذات والوں کا مقدر ہے۔ نہ اونچی ...... ذات والوں سے کوئی شخص ان کی دولت اور قوت چھین سکتا ہے۔ نہ نیچی ذات والوں کے ذلت و افلاس کا کوئی علاج کر سکتا ہے۔ جو ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ برہما کے فیصلوں کو الٹنا چاہتا ہے۔ لہذا اس کی یہ کوشش ایشور پرماتما کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کے وضع کر لینے سے انسان نے کس طرح اپنے آپ کو ایسی اہم اور مہیب ذمہ داریوں سے بچا لیا؟ اس سے 'بالادست طبقہ کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ زیر دستوں پر جس قدر ظلم و ستم چاہیں روا رکھیں۔ اس کی ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ذمہ داری ساری برہما کی ہے۔ وہ، برہما کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ذرائع (Instrument) ہیں اور بس۔ دوسری طرف، زیر دست طبقہ تھا جسے چاہیئے تھا کہ وہ اس ذلت آمیز اور ننگ انسانیت سلوک (یا نظامِ معاشرت) کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔ لیکن اس نے اسے انتہائی بے حمیتی سے برداشت کیا اور اپنی ذمہ داری کو برہما کے فیصلے کی آڑ میں چھپا کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ اس کے علاوہ اس سے انہیں ایک اور جھوٹی تسکین بھی حاصل ہو گئی۔ جب انسان یہ سمجھے کہ اس کی مصیبتیں اور تکلیفیں اس کے سابقہ اعمال کا نتیجہ ہیں تو اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس میں اب کوئی خرابی نہیں۔ یہ تکلیفیں ان خرابیوں کا نتیجہ ہیں جو اس میں کسی سابقہ زمانہ میں ہوا کرتی تھیں۔

(۲) یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے کلیسائے عیسائیت نے یہ عقیدہ اپنایا کہ ہر انسانی بچہ، اپنے اولین ماں باپ کا گناہ لے کر دنیا میں آتا ہے اور یہی وہ گناہ ہے جو دنیا میں تمام فسادات کا موجب ہے۔ اس سے مستبد قوتیں اپنی ان حرکات کی ذمہ داریوں سے مامون ہو گئیں جن کا نتیجہ، انسانی دنیا میں فتنہ و فساد تھا۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہوں کے آسمانی حقوق (Divine Rights of the Kings) کا عقیدہ

وضع کر لیا گیا۔ جس کی رو سے مطلق العنان حکمرانوں کو، اپنے آمرانہ فیصلوں اور مستبدانہ کارناموں سے بری الذمہ ہونے کی سند مل گئی۔ دوسری طرف، محتاجوں اور غریبوں۔ مظلوموں اور ستم رسیدوں کو یہ کہہ کر اطمینان دلا دیا گیا کہ خدا کی بادشاہت تمہارے ہی لئے ہے۔ یہ امیر اس میں قدم تک نہیں رکھ سکیں گے۔ اس لئے تم ان کی دولت و ثروت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ باقی رہی تمہاری نجات ـــــ اس دنیا کی مصیبتوں سے نجات نہیں کیونکہ یہ مصیبتیں تو خدا کے مقرب بندوں کی علامات ہیں۔ اگلی دنیا میں عذاب سے نجات ـــ سو اس کے لئے تم جناب مسیح کے کفارہ پر ایمان رکھو ـــ اس کے بعد تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، سوائے ان چند رسومات کے جو کلیسا کی طرف سے مقرر کی جائیں۔ کفارہ پر ایمان اور کلیسا کی اطاعت سے، عوام اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے۔

(۳) ایران میں اس مقصد کو عقیدۂ تقدیر کی رو سے حاصل کیا گیا۔ دنیا میں جو کچھ انسان کو پیش آتا ہے وہ اس کی تقدیر کے نوشتے کے مطابق ہوتا ہے، جو اس کی پیدائش سے بہت پہلے لکھا گیا تھا اور جسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ عزت، ذلت۔ امیری، غریبی۔ کشائش، تنگدستی۔ مصیبت، بیماری۔ حکومی، زبوں حالی۔ سب تقدیر کے مطابق واقع ہوتی ہیں۔ اس سے ارباب اقتدار اپنی تمام دراز دستیوں سے اور معاشرہ اپنی وسیع کاریوں سے بری الذمہ قرار پا گیا۔ دوسری طرف، مظلوم و محکوم طبقہ نے اپنے آپ کو، تقدیر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سمجھ کر، مستبد نظام کے الٹ دینے کی ذمہ داری سے سبکدوش تصور کر لیا۔

(۴) اختیار و ارادہ کی ذمہ داریوں سے بچنے کا آسان ترین راستہ یہ ہے کہ انسان خود کوئی فیصلہ نہ کرے۔ دوسروں کے فیصلوں کو سند تسلیم کر لے۔ اس مقصد کے لئے انسان نے اسلاف پرستی کی روش اختیار کی جو چین میں انتہائی شدت تک ـــــ پہنچ گئی۔ اس مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو۔ آپ اس کے متعلق غور و فکر سے خود کسی فیصلہ تک نہ پہنچیں بلکہ یہ دیکھیں کہ اسلاف میں سے کسی نے، ایسے معاملہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا تھا۔ بس اس فیصلہ کو اپنے لئے سند قرار دے لیجئے اور اس طرح اپنی نااہلی، اور ذمہ داریوں سے فرار کو، اسلاف کے احترام اور عقیدت کے مقدس نقاب میں چھپا لیجئے۔ دنیائے مذاہب میں انسان نے ہمیشہ یہ روش اختیار کی ہے۔

(۵) اطنیت نے (جس کا چشمہ بھی یونان کی سرزمین سے پھوٹا تھا) اس باب میں رہی سہی کسر پوری کر دی۔ "ہمہ اوستی" نظریہ کی رو سے، انسان کسی عمل کا ذمہ دار ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس میں علت (Cause) بھی خدا ہی ہوتا ہے اور معلول (Effect) بھی خدا۔ قائل بھی وہی ہوتا ہے، مقتول بھی وہی۔ لہٰذا، اس میں کسی کی ذمہ داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے نیچے اتر یئے، تو "راضی برضا" کا مسلک سامنے آتا ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان جس حالت میں بھی ہے، خدا کی مرضی سے ہے۔ انسان کو اُس کی مرضی سے راضی رہنا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر اُسے اپنے حالات کے بدلنے کا خیال تک بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ چیز مرضیٔ مولا کے خلاف ہوگی۔ اس میں تلقین یہ ہوتی ہے کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

(۷) یہ نظریات زمانۂ قدیم کی یادگار ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ عصرِ حاضر، جو علوم اور روشنی کا زمانہ ہے ......، اس باب میں، عہد تاریک سے مختلف ہوگا۔ لیکن آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ اس باب میں، یہ عہد روشن، تاریکی کے زمانے سے چنداں مختلف نہیں۔ اس میں بھی انسان کو مجبور تصور کرکے، ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ اس میں اصطلاحات مختلف استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً ماہرین علم الحیات (Biologists) کی "تحقیق" یہ ہے کہ ہر فرد، اپنے ساتھ، پیدائشی طور پر بعض خلئیے اور غدود اس قسم کے لاتا ہے جن سے اس کا کیریکٹر مرتب ہوتا ہے۔ لہذا، جو کچھ وہ کرتا ہے اس میں اس کے اختیار و ارادہ کو کچھ دخل نہیں ہوتا، اسی طرح، جیسے اُسے اس پر کچھ اختیار نہیں ہوتا کہ اُس کی جلد کا رنگ کیسا ہے یا آنکھوں کی ساخت کیسی۔

علمائے عمرانیات (Sociologists) کی "تحقیق" یہ ہے کہ انسان، اپنے صدیوں پہلے کے آباؤ اجداد کی خصوصیات، وراثتاً اپنے ساتھ لاتا ہے جنہیں تبدیل کر دینا اس کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ اس کا پورا کردار انہی موروثی اثرات کا مجموعہ ہوتا ہے۔

ماہرین علم النفس (Psycho-Analysis) کی تحقیق، یہ ہے کہ انسان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے، وہ اپنی پیدائش کے پہلے دو تین سال میں (بلکہ بعض کے نزدیک پیدائش سے بھی پہلے) بن چکتا ہے۔ اُس زمانے کے تاثرات اس کے تحت الشعور میں اس طرح جاگزیں ہوتے ہیں کہ انسان کو شعوری طور پر ان کا علم احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا ہر فیصلہ اور عمل، انہی تاثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ان کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مارکسزم آگے بڑھی اور اس نے کہا کہ انسان پیداوار ہوتا ہے اپنے معاشی ماحول کا۔ اور معاشی ماحول کا مرتب کرنا یا اسے بدلنا انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ایک قسم کا معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔ بڑھتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ پھر اس پر زوال آ جاتا ہے اور اس میں سے، ایک اور نظام پھوٹتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے جدلیات (Dialectic) کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ تاریخی وجوب Historical (Necessity) کے زور پر ہوتا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ دنیائے قدیم ہو یا جدید، گوشۂ مذہب ہو یا لامذہبیت۔ ان میں کس طرح لپیٹے

عقیدے وضع اور ایسے نظریئے مرتب کئے گئے جن سے انسان ذمہ داری سے بچ جائے۔ لیکن گریز اور فرار کی اس پوری دنیا میں آپ کو ایک استثناء (Exception) نظر آئے گی۔ اور وہ ہے انسان کے متعلق وہ تصور جسے قرآن کریم نے پیش کیا۔ وہ تصور یہ ہے کہ

(۱) ہر انسانی بچہ ایک لوح سادہ (Clean Slate) لے کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ نہ اپنے سابقہ جنم کے اعمال لے کر دنیا میں آتا ہے اور نہ ہی اپنے اولیں ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ۔ اس لئے پیدائش کے اعتبار سے نہ کوئی برہمن ہوتا ہے۔ نہ کھشتری۔ نہ ویش، نہ شودر۔ ہر انسانی بچہ محض انسان ہوتا ہے۔ اسے دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں، نہ خاص حقوق و مراعات حاصل ہوتے ہیں، اور نہ ہی، اس کے راستے میں، بطور سزا، ایسے مواقع حائل کر دیئے جاتے ہیں جنہیں وہ رفع نہیں کر سکتا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق کائنات کا نظم و نسق بایں حسن و خوبی چل رہا ہے۔ یہ قوانین، طبیعی دنیا (Physical world) سے متعلق ہیں جن کا علم، مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح، کچھ قوانین خود انسانی دنیا سے متعلق بھی ہیں جن کا علم وحی کے ذریعے دیا گیا ہے۔ انسان کا ہر عمل، ان قوانین کے مطابق نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یہ قوانین بھی اٹل ہیں اور ان کے نتائج بھی غیر متبدل۔ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے سرکشی اختیار کرلے۔ اگر وہ ان کے مطابق چلے گا تو اسے زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں گی۔ اگر ان کی خلاف ورزی کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ اسے ان نقصانات سے نہ کسی کا کفارہ بچا سکتا ہے، نہ سفارش۔ نہ وہ رشوت دیکر چھوٹ سکتا ہے، نہ کسی قسم کا اثر ڈال کر۔ اس کی زندگی اس کے اعمال ہی سے مرتب ہوتی ہے اس دنیا میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔

(۳) انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام اس کی تقدیر ہے جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے۔ اس کی قسمت پہلے سے لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ وہ اسے، اپنی لوح زندگی پر ساتھ کے ساتھ لکھتا جاتا ہے۔ وہ اپنے لکھے کو خود ہی مٹا بھی سکتا ہے ــــ یعنی اگر ایک مرتبہ اس کا قدم غلط اٹھ گیا ہے، تو اپنے صحیح عمل سے، وہ، اس غلط اقدام کے مضر اثرات سے بچ سکتا ہے۔

(۴) یہ ٹھیک ہے کہ ایک فرد کی طبیعی ساخت۔ موروثی خصائص۔ بچپن کے تاثرات وغیرہ اس کے عمل و ارادہ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ لیکن انسان کو ایک ایسی چیز بھی دی گئی ہے جو ان تمام اثرات پر غالب آ سکتی ہے اور وہ ہے اس کی ذات (Personality) جسے قرآن "الوہیاتی توانائی" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی ذات، بے پناہ قوتوں کی

امین ہوتی ہے۔ ایسی قوتوں کی جن پر کوئی اور قوت غالب نہیں آسکتی۔ اس لئے دیگر اثرات، اس کے ارادوں اور فیصلوں کے راستے میں روڑا بن کر نہیں اٹک سکتے۔ اس کی ذات ان سب پر غالب آسکتی ہے۔

(۵) "تاریخی وجوب" کا نظریہ غلط ہے۔ ہر قسم کا نظام، انسان خود ہی بناتا ہے اور خود ہی اسے بدل سکتا ہے۔

(۶) اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات، افراد غلط اور مستبدانہ نظام کے محکوم ہو جاتے ہیں اور اس میں ان کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ ہمت کریں تو اس قسم کے نظام کو بدل سکتے ہیں۔ جس قدر افراد فرماں پذیر اور اطاعت گزار ہوں گے، اسی قدر وہ نظام مضبوط اور مستحکم ہوگا۔ اگر یہ لوگ اسے بدلنے کی ٹھان لیں تو وہ (نظام) قائم رہ نہیں سکتا۔ کسی حادثہ کی وجہ سے، مستبد نظام کے تابع آجانا اور بات ہے اور اس نظام میں مطمئن ہو کر بیٹھ جانا اور بات۔

آپ، انسان کے متعلق قرآن کے اس تصور پر غور کیجئے اور سوچئے کہ اس کی ایک ایک شق کس طرح انسان کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتی چلی جاتی ہے اور اس کے لئے فرار کی کوئی راہ اور گریز کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ آپ قرآن کریم کو شروع سے اخیر تک پڑھئے اور دیکھئے کہ اس کا ایک ایک ورق کس طرح اس حقیقت کو اجاگر کئے جاتا ہے کہ انسان اپنے ہر ارادہ، فیصلہ، اور عمل کے لئے آپ ذمہ دار اور جوابدہ ہے، اور وہ اس ذمہ داری کو کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکتا۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر قرآنی تعلیم کی ساری عمارت استوار ہے اور اسے انسانوں کے تمام خود ساختہ نظریات کے خلاف، ایک منفرد حیثیت دیتی ہے۔ خواہ یہ نظریات دنیا کے مذہب سے متعلق ہوں، یا جہانِ علم و تحقیق (سائنس) سے۔ خواہ وہ زمانۂ قدیم کی پیداوار ہوں، یا عصرِ حاضر کی تخلیق۔ وہ ان سب سے الگ، ایک مقام بلند پر کھڑا، انسان کو پکار پکار کر اس کی ذمہ داریوں کی یاد دلاتا ہے۔

وہ انسان کے متعلق واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (۷۶/۳) ہم نے اسے، راستہ دکھا دیا۔ اب اس کا جی چاہے تو اسے اختیار کر لے۔ اور جی چاہے اس سے انکار کر کے غلط راہوں پر چل نکلے۔ دوسری جگہ ہے۔ قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَّمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ ان سے کہدو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کر لے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اختیار و ارادہ کی جو صلاحیت تمہیں دی گئی ہے، اس کی رُو سے تم اپنے لئے خود فیصلے کرو اور اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰)۔ جو تمہارا جی چاہے کرو لیکن اتنا یاد رکھو کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا (۴۱/۴۶)۔ جو شخص اچھے کام کرے گا اس کا فائدہ خود اسی کو ہوگا۔ جو برے کام کرے گا اس کا نتیجہ بھی اسے ہی بھگتنا پڑے گا۔ اس انداز سے کہ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹/۸) - جو ذرہ برابر بھی عمل خیر کرے گا وہ اس کے سامنے آجائے گا۔ اور جو ذرہ برابر بُرا کام کرے گا وہ بھی اس کے سامنے آجائے گا۔ کوئی شخص کسی کو اس کے کسی عمل کے نتیجہ سے بچا نہیں سکتا۔ لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (۲/۱۲۳) - نہ کسی کی سفارش کوئی کام دے سکتی ہے۔ نہ کوئی فدیہ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ اعمال کے جو نتائج قانون کے مطابق مرتب ہوں، اس میں ــــ سفارش یا فدیہ اور کفارہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص آگ میں ہاتھ ڈالے گا اس کا ہاتھ جل جائے گا۔ کسی کی سفارش۔ دوستی۔ رشوت۔ کفارہ، ایسا نہیں کر سکتا کہ اس کا ہاتھ نہ جلے۔ نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ آگ میں ہاتھ یہ ڈالے اور اس کی جلن کا درد دوسرے کو ہو۔ اس لئے کہ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا۔ جو کرتا ہے اس کا خمیازہ اس کو بھگتنا ہوتا ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۴)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (۶/۱۰۴) جو شخص آنکھیں کھول کر چلے اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جو آنکھیں بند کر کے اندھوں کی طرح چلے، اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کس طرح ہر کام کے لئے اس کو ذمہ دار قرار دیتا ہے جس سے وہ کام سرزد ہو۔ اور اس کا دائرہ صرف محسوس اعمال تک ہی نہیں بلکہ وہ دل میں گذرنے والے خیالات تک کی بھی ذمہ داری عائد کرتا ہے يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)۔ خدا کا قانونِ مکافات، نگاہ کی خیانت اور دل میں پوشیدہ خیالات تک سے بھی واقف ہے۔

جو لوگ یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا، وہ انہیں بُری سختی سے ٹوکتا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ۔ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے، اسے محتاجوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا رکھو، تو جو لوگ کفر کی روش اختیار کئے ہیں، وہ مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے شخص کی روزی کا انتظام کریں کہ اگر اللہ چاہتا تو وہ اس کی روزی کا خود انتظام کر دیتا۔ یعنی وہ پہلے غلط معاشی نظام قائم کرتے ہیں جس میں لوگ بھوکے مریں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ان بھوکوں کی روٹی کا انتظام کیوں نہیں کرتے تو کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہی ایسی ہے کہ یہ بھوکے رہیں۔ اگر اس کی ایسی مرضی نہ ہوتی تو یہ کبھی بھوکے نہ رہتے۔ ہم خدا کی مرضی کے خلاف کس طرح کر سکتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۶/۱۵)۔ ان سے کہو کہ یہ کتنی بڑی گمراہی کی بات ہے جو تم کر رہے ہو! اسی طرح کئی ایک اور مقامات پر بھی آیا ہے کہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اگر اللہ کی مرضی ایسی نہ ہوتی تو ہم ایسا کبھی نہ کرتے۔ قرآن کہتا ہے کہ کفار اور مشرکین کی یہ باتیں جہالت اور ظن و قیاس پر مبنی ہیں۔ (باقی صفحہ ۹ پر دیکھئے)

دینِ خداوندی کے مخالفین

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (۶۰/۱) "اے جماعتِ مومنین! تم نے میرے دشمن اور اپنے دشمن کو کبھی اپنا دوست نہ بنانا"۔ اپنے دشمن کو ہر شخص جانتا ہے (یا جان سکتا ہے) اور کوئی صاحبِ ہوش دشمن کو دوست نہیں رکھتا لیکن یہاں خدا نے ایسے دشمن کا ذکر کیا ہے جو خدا اور جماعتِ مومنین کا مشترکہ دشمن ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا اور جماعتِ مومنین کا مشترکہ دشمن کون ہو سکتا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ جو دینِ خداوندی کا مخالف ہے وہی خدا اور جماعتِ مومنین کا دشمن ہے۔ اس لئے کہ مومن کی ہستی ہی دین کے ساتھ ہے۔ اس کے دین کو فروغ اور اقتدار حاصل ہے تو مومن بھی صاحبِ عزت و توقیر ہے۔ اور اگر اس کے دین کا غلبہ نہیں، تو مومن کی بھی دنیا میں کوئی عزت نہیں۔ دینِ خداوندی کے مخالفین کی فہرست تو لمبی چوڑی ہو سکتی ہے لیکن اصل کے اعتبار سے قرآن نے انھیں دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا تذکرہ ایسی شرح و بسط سے کیا ہے کہ ان کے پہچاننے میں کسی کو دشواری نہ ہو۔ کہ دینِ خداوندی کے وہ مخالف ہیں جن کا تعلق نہ کسی خاص مقام سے ہے نہ زمان سے۔ دنیا میں جب اور جہاں بھی خدا کے دین کی آواز بلند ہوئی، یہ گروہ فوراً مخالفت کے لئے میدان میں اتر آئے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دین کی فروعات کتنی ہی کیوں نہ بدلتی رہی ہوں، اصل کے اعتبار سے دین شروع سے اخیر تک ایک ہی رہا ہے اور اس کی زد ان دونوں گروہوں پر ہمیشہ پڑتی رہی ہے جبھی تو ان گروہوں کی طرف سے ہر جگہ اور ہر زمانے میں اس کی مخالفت ہوتی رہی ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ یہ گروہ کونسے ہیں۔

گروہِ اوّل

قرآن کریم نے دین کے تذکرہ کی ابتداء حضرت نوحؑ سے کی ہے۔ سورہ اعراف میں ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (پ ۸)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف (حق کا پیغام دیکر) بھیجا۔ اس نے کہا۔ اے میری قوم! تم خدا کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہیں ڈرتا ہوں کہ (تمہاری موجودہ روش سے) ایک بڑا ہی ہولناک عذاب تم پر مسلط نہ ہو جائے۔

دعوتِ حضرت نوحؑ یہ تھی حضرت نوحؑ کی دعوت یعنی حکومت و اقتدار صرف خدا کا ہے۔ اس کے سوا تم کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو۔ یہ دعوت صاف اور واضح ہے۔ اب دیکھئے کہ اس دعوت کی مخالفت کس گروہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ - اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (پ ۸) اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "اس کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جواب دیا کہ ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گئے ہو۔" قرآن کریم نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ اَلْمَلَاُ ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھر بھرے ہوں۔ جن کی کوٹھیاں اناج سے بھری ہوں۔ جن کے خزانے دولت سے بھرے ہوں۔ جن کے برتن سامان خورد و نوش سے لبریز ہوں۔ یہی لوگ ہیں جو قوم کے سردار کہلاتے ہیں۔ یہی ان کے اکابر اور سربراہ ہوتے ہیں۔ انہی کی رائے، رائے کہلاتی ہے۔ اور ان کی عقل، عقل جس کے گھر کھانے کو نہ ہو۔ جس کے برتن خالی ہوں، وہ لاکھ سمجھ کی بات کرے، کوئی اُسے درخورِ اعتناء نہیں سمجھتا۔ پنجابی زبان میں

سرمایہ داروں کا طبقہ ایک مثل ہے کہ "جس دی کوٹھی دانے، اس دے کملے وی سیانے" جس کے گھر کھانے کو ہو، اس کے پاگل بھی عقلمند سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن نے کہا یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت کی مخالفت، قوم کے دولتمند طبقے کی طرف سے ہوئی جن کے ہاتھوں میں اقتدار تھا۔ دوسری جگہ ان کے متعلق یہ کہہ کر بات واضح کر دی کہ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۲۳/۳۳) یعنی یہ وہ طبقہ تھا جسے دنیا میں آسودگی اور خوشحالی حاصل تھی۔ جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔ یہ تھا وہ گروہ جس نے سب سے پہلے مخالفت کی آواز بلند کی۔ ظاہر ہے کہ یہ آسمانی دعوت ایسی تھی جس کی زد براہ راست سرمایہ دار طبقہ پر پڑتی تھی۔ یہ محض "پوجا پاٹ" کا سوال نہیں تھا۔ یہ دعوت ایک ایسے انقلاب کی پیغامبر تھی

جس سے دولت مند طبقہ کو اپنے مفاد خطرے میں دکھائی دیتے تھے۔ وہ اسی لئے اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے کیونکہ اس کی کامیابی میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ دولتمند طبقہ ہمیشہ اس زعم میں رہتا ہے کہ دنیا بھر کی عقل و فکر کے واحد مالک اور سمجھ بوجھ کے اجارہ دار وہی ہیں۔ غریب کو نہ عقل ہوتی ہے نہ تمیز۔ نہ اس کی کوئی بات ایسی ہوتی ہے جس پر کان دھرا جائے اور نہ کوئی فیصلہ ایسا جسے توجہ کے قابل سمجھا جائے۔ اس کی مفلسی اسے بے وقوف اور بے سمجھ اور اس کی غریبی اسے پست اور ذلیل بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یہی تھی وہ ذہنیت جس کا مظاہرہ

غریبوں کی طرف سے لبیک

قوم نوحؑ کے سربراہوں کی طرف سے ہوا جب انہوں نے کہا کہ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ۔ انہوں نے حضرت نوحؑ سے کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔ اور جو لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں، ان کی تو شکلیں دیکھ کر بتا دیا جا سکتا ہے کہ وہ ہم میں کمینے ہیں۔ وہ واجبی عقل کے مالک ہیں۔ یوں ہی بلا سمجھے بوجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ذلیل اور سطحی سمجھ بوجھ کے لوگوں کی ایک جماعت ہے جو تمہارے ساتھ ہو گئی ہے۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (۱۱/۲۷) ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے۔ نہ تم میں کوئی صاحبِ دولت و ثروت نہ عقل و فکر کا مالک۔ نہ معاشرہ میں اس کی اونچی پوزیشن۔ تمہارا دعویٰ کس طرح سچا ہو سکتا ہے؟ دعویٰ اس کا سچا ہو سکتا ہے جس کی تائید سوسائٹی کا ... بر کا طبقہ کرے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

آپ نے غور کیا کہ ان لوگوں کے نزدیک، حق و باطل، صدق و کذب اور عزت و ذلت کا معیار کیا ہوتا ہے؟ فقط دولت اور اس کے زور پر حاصل کردہ اقتدار۔ آسمانی دعوت اس معیار کو بدلنے کے لئے آتی ہے اور اسی لئے اس طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۱۱/۸۲) جو طبقہ اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق، بلندیوں پر ہوتا ہے وہ پستیوں میں آگرتا ہے۔ یہی خطرہ ان کی مخالفت کا محرک ہوتا ہے۔

حضرت ہودؑ کی دعوت

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ تشریف لائے اور انہوں نے اپنی قوم کو وہی دعوت دی جو حضرت نوحؑ نے دی تھی یعنی (يٰقَوْمِ) اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۶۵) "اے میری قوم! تم اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں" اور اس کا ردِ عمل وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ﴿۲۳/۳۳﴾

اس کی قوم کے سرداروں نے جنھوں نے سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، اور آخرت کے پیش آنے کے منکر تھے، اور جنھیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی اور خوش حالی عطا کر رکھی تھی، (لوگوں سے) کہا کہ "اس شخص کی اس سے زیادہ کیا حیثیت ہے کہ تمہارے جیسا عام آدمی ہے۔ جو کچھ تم کھاتے ہو، یہ بھی کھاتا ہے۔ جو کچھ تم پیتے ہو، یہ بھی پیتا ہے۔

اس کے بعد ان سے کہا کہ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت قبول کر لی تو پس سمجھ لو کہ تم تباہ ہوئے (۲۳/۳۴)۔ دوسری جگہ ہے کہ ان سردارانِ قوم نے کہا کہ (إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ (۷/۶۶)) ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو۔

سوال یہ ہے کہ اس قوم کی وہ کونسی غلط روش تھی جس سے باز رہنے کی انھیں دعوت دی جا رہی تھی؟

قوم کی حالت

قرآن کریم کہتا ہے کہ انھیں بڑی وسعت اور توانائی حاصل تھی (وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً۔ ۷/۶۹) ان کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور مال مویشی بھی بکثرت لئے تھے نیز سرسبز و شاداب باغات اور جاری چشمے۔ وَأَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (۲۶/۱۳۴) وہ ایسے رفیع الشان محلات اور محکم قلعے تعمیر کرتے تھے گویا انھیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ (وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (۲۶/۱۲۹)) انھیں اس قدر قوت و سطوت حاصل تھی جو کسی اور کو حاصل نہیں تھی (وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ ۴۶/۲۶) انھیں اس قدر قوت حاصل تھی لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس قوت کو حق و انصاف، اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف کرتے، وہ بیحد سرکش اور متکبر ہو گئے۔ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱/۱۵)۔ قوت کے نشہ میں ان کی بدمستی کی حالت یہ تھی کہ جس کمزور پر ہاتھ ڈالتے اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے۔ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ (۲۶/۱۳۰) یہ تھی وہ قوم جو دعوتِ خداوندی کی دشمن تھی اور جس کے اکابرین نے اس دعوت کی مخالفت کی۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ اس کے متعلق قرآن کریم نے چار لفظوں میں پوری داستان بیان کر دی جب کہا کہ وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ (۷/۷۲) اور جنھوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی تھی، ہم نے ان کی جڑ بنیاد تک اکھیڑ دی۔ وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں تھے۔

دعوتِ حضرت صالحؑ

قوم عاد کے بعد قوم ثمود کا تذکرہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ قوم بھی بڑی سطوت و ثروت کی مالک تھی۔ پُر فضا باغات، شیریں چشمے، لہلہاتی کھیتیاں، پھل اور درخت (فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۝ ۲۶/۱۴۷-۱۴۸)، وہ میدانوں میں محلات اور پہاڑوں میں قلعے بناتے (وَتَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۷/۷۴) جب انسان کو اس قدر فراواں قوت اور دولت میسر ہو اور اسے وہ استعمال اپنی مرضی کے مطابق کرے، تو اس کا نتیجہ فساد کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اس قوم کے نمایندگان کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ

اور شہر میں نو سربرآوردہ اکابرین، تھے جو ہمیشہ ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور (۲۷/۴۸) اصلاح کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔

اس قوم کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے جنہوں نے آکر وہی پیغام دیا جو اس سے پہلے حضرات انبیائے کرامؑ دیتے چلے آرہے تھے۔ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (۷/۷۳) "اس نے کہا کہ اے میری قوم! تم خدا کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں" اس پیغام پر لبیک کن لوگوں نے کہا اور اس کی مخالفت کن لوگوں کی طرف سے ہوئی، اسے قرآن کریم کے الفاظ میں سنیئے۔ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ

دولتمند طبقہ کی مخالفت

اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ (۷/۷۵) "قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو اپنی دولت اور قوت کا گھمنڈ تھا، انہوں نے مومنوں سے کہا یعنی ان لوگوں سے جنہیں ان کی چیرہ دستیوں نے کمزور کر رکھا تھا" آپ نے غور کیا کہ اس دعوتِ خداوندی کو ماننے والا غریبوں اور کمزوروں کا طبقہ تھا اور اس کی مخالفت اربابِ دولت و اقتدار کی طرف سے ہوئی تھی۔ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ (۷/۷۶) ان سرکش اور متکبرین نے کہا کہ تم جس بات پر ایمان رکھتے ہو، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

یہ دعوت کیا تھی اور اس کی مخالفت کس بنا پر تھی؟ اس زمانے میں مال مویشی سب سے بڑی دولت تھے۔

ان کی غلط روش

اس لئے چراگاہوں اور چشموں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ قوم کا دولتمند اور صاحبِ اقتدار طبقہ، ان ذرائع رزق پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا اور غریبوں اور کمزوروں پر ان کے راستے بند کر دیتا تھا یہی کچھ قوم ثمود کے اکابرین نے کر رکھا تھا۔ وہ غریبوں کے جانوروں کو خدا کے عطا کردہ چشموں سے پانی تک نہیں پینے دیتے تھے۔ یہ تھی ان کی مفسدانہ روش جس کے خلاف حضرت صالحؑ نے

آواز اٹھائی تھی۔ اس کے جواب میں پہلے تو ان سردارانِ قوم نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت صالحؑ اور ان کے متبعین کو ختم ہی کر دیا جائے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (۲۷/۴۹)

"انھوں نے (آپس میں مشورہ کیا اور) کہا کہ ایک دوسرے کے سامنے خدا کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کو (حضرت صالحؑ) اور اس کے ساتھیوں پر یکبارگی حملہ کرکے (انھیں قتل کر دیں گے) اور پھر (جب پوچھ گچھ ہوگی تو) ہم اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کے وقت موجود ہی نہیں تھے۔ اور ہم اپنے اس بیان میں بالکل سچے ہیں"۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور انھیں حضرت صالحؑ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا۔ سمجھوتے کی شرط یہ تھی کہ وہ غریبوں کے جانوروں کو خدا کی زمین میں آزاد چرنے دیں اور چشموں سے ان کی باری پر انھیں پانی پینے دیں (۲۶/۱۵۵)۔ حضرت صالحؑ نے ان سے کہا کہ تمہارے اس قول و اقرار کے عملی ثبوت کے لئے میں ایک اونٹنی چھوڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ ان لوگوں نے کہنے کو تو یہ اقرار کر لیا لیکن سرمایہ دارانہ ذہنیت اسے کب گوارا کر سکتی تھی کہ جن رزق کے سرچشموں کو وہ اپنی واحد ملکیت سمجھتے تھے، ان میں غریب بھی برابر کے حصہ دار ہو جائیں اور اس طرح اُن کی غلامی سے نکل کر آزاد انسانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (۷/۷۷)۔ انھوں نے اس اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۴۱/۱۷) ذلت اور رسوائی کے عذاب کی ایک کڑک نے انہیں آ پکڑا اور یہ سب کچھ ان کے ان جرائم کی وجہ سے ہوا جن کے وہ مرتکب ہوئے تھے۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا (۲۷/۵۲) سو دیکھو! یہ ہیں ان کے محلات جو ان کے ظلم کی وجہ سے اس طرح ویران پڑے ہیں۔ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (۱۱/۹۵) گویا کہ وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۲۷/۵۲)

ہم نے یہ داستان محض ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے نہیں دہرائی۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہیں عبرت و موعظت کی بڑی نشانی ہے۔

قومِ شعیبؑ قوم ثمود کے بعد ہمارے سامنے قوم (حضرت) شعیبؑ آتی ہے جو مَدین کے علاقہ میں رہتی تھی۔ انھیں بھی حضرت شعیبؑ نے وہی دعوت دی جو اس سے پہلے انبیاء کرامؑ اپنی اپنی قوم کو دیتے چلے آ رہے تھے۔ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (۷/۸۵)، اس نے کہا کہ اے میری قوم! تم خدا کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ قوم کیا کرتی تھی جس سے رُکنے کے لئے انہیں خدا کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ قرآن کریم نے اسے خود واضح کر دیا ہے جب کہا کہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ اَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (۷/۸۵)، ناپ تول پورا رکھو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں پوری پوری دو۔ ملک میں ہماریاں ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ آپ نے دیکھا کہ اُن کی کون سی غلط روش ہے جس سے انھیں باز رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے؟ وہی روش جو نظامِ سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس (باطل) اصول پر ہے کہ جب دوسروں سے چیز لو، تو جو کچھ واجب ہو اس سے زیادہ لو۔ اور جب انھیں دو، تو جو کچھ واجب ہے اس سے کم دو یعنی لیتے اور دیتے وقت، ناپ اور تول کے پیمانے مختلف رکھو۔ کسی کی کسی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دو۔ یہ تھی ان کی روش جس کے متعلق حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا تھا کہ اَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۶/۱۷۷) کیا تم اس روش کے تباہ کن نتائج سے ڈرتے نہیں؟

اس کے جواب میں انھوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ ہم سے مذہب کے متعلق اتنا ہی سنا تھا کہ اس کا تعلق پوجا پاٹ اور بندگی اور پرستش سے ہے کسی نے دیوتاؤں کی پوجا کرلی، کسی نے بتوں کی۔ کوئی آگے بڑھا تو اس نے خدا کی پرستش کی دعوت دیدی لیکن یہ تمہارا "مذہب" عجیب ہے جو یہ کہتا ہے

یہ عجیب صلوٰۃ ہے کہ ہم اپنے مال و دولت میں بھی اپنا اختیار و ارادہ نہ برتیں۔ اسے قوانینِ خداوندی کے تابع رکھیں! قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ ... اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ (۱۱/۸۷)۔ انھوں نے کہا کہ اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تمہیں اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے مال و دولت میں بھی، اپنی مرضی کے مطابق بھی تصرف نہ کریں؟ (اور اسے محتاجوں اور ضرورت مندوں کے لئے خالی رکھیں)۔ بس تم ہی ایک غریبوں کے ہمدرد۔ نرم دل۔ اور راست باز انسان رہ گئے ہو؟

لیکن جب حضرت شعیبؑ اپنی دعوت پر اصرار کرتے چلے گئے تو قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا (۷/۸۸)۔ قوم کے سرداروں نے جنھیں اپنے مال و دولت پر گھمنڈ تھا، کہا۔ اے شعیب (دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی)۔ یا تو ہم

تمہیں مجبور کر دیں گے کہ ہمارے مسلک کی طرف لوٹ آؤ۔ اور یا ہم تجھے اور تیرے ساتھیوں کو، جو تمہارے ساتھ اس دعوت پر ایمان لے آئے ہیں، اپنے شہر سے باہر نکال دیں گے۔"

دھمکیاں آپ نے دیکھا کہ اس دھمکی کے ایک ایک لفظ میں، کس طرح دولت اور قوت کی بدمستیاں کسوتِ مینا سے چھلک کر باہر آ رہی ہیں۔ اور یہ چیز آج سے تین چار ہزار پہلے بسنے والی قوم مدین ہی سے مختص نہیں۔ دولت اور قوت جب بھی حدودِ اللہ سے باہر نکلی ہے، اس سے اس قسم کے مظاہرے ہوئے ہیں — چہار ہزار سال پہلے بھی اور آج بھی۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی۔ نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہی۔ وہی مرحبی وہی عنتری

یہ کچھ تو حضرت شعیبؑ سے کہا۔ اور جو غریب ان کے ساتھ ہوئے تھے انہیں یہ کہہ کر دھمکایا کہ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ ۝ (۷/۹۰) "اگر تم نے شعیب کی پیروی تو سمجھ لو کہ تم برباد ہوئے"

لیکن حضرت شعیبؑ اپنی دعوت کو برابر پیش کرتے چلے گئے۔ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی طرف سے اس کی مخالفت بھی بڑھتی چلی گئی۔ کبھی وہ کہتے يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ (۱۱/۹۱)۔ "اے شعیب! جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے اکثر باتیں ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں — ٹھیک ہے۔ سرمایہ دار کی سمجھ میں یہ بات آ یا ہی نہیں کرتی کہ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ معاوضہ محنت کا ہوتا ہے۔ روپے کا نہیں۔ روپے کا معاوضہ ربوٰ ہے جسے نظامِ خداوندی حرام قرار دیتا ہے — اور کبھی وہ حضرت شعیبؑ سے کہتے کہ إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ (۲۶/۱۸۵)۔ "تم جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔"

لیکن ان کے ان طعنوں اور دھمکیوں سے، غلط نظام کے تباہ کن نتائج رُک تھوڑے سکتے تھے۔ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۝ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا (۷/۹۱-۹۲)۔ سو ایک لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا۔ اور جب ان پر صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا تھا وہ ایسے تباہ ہوئے، گویا وہ ان بستیوں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ وہ تھے ہی برباد ہونے والے، اس لئے کہ

"تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو"

کشمکش کلیمیؑ و فرعونی

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ سرزمین آتی ہے جو تاریخ کے اس دور میں کشمکش حق و باطل کی سب سے بڑی رزمگاہ قرار پائی اور جس میں عصائے کلیمیؑ اور سحرِ فرعونی کا بھرپور ٹکراؤ ہوا۔ مشیتِ ایزدی کے مطابق حضرت موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے محلات میں ہوئی تھی جہاں انہیں اس کے مطالعہ کرنے کا نہایت عمدہ موقعہ مل گیا کہ سیاست کی وسیسہ کاریاں، اپنے اقتدار و اختیار کو قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرتی ہیں لیکن ابھی ان کے لئے یہ دیکھنا باقی تھا کہ اربابِ قوت خدا کی طرف سے بلامعاوضہ عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو کس طرح اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا موقعہ اس وقت آیا جب وہ مصر سے بھاگ کر مدین کی طرف گئے ہیں وہ راستے میں ستانے کے لئے ایک پیاؤ کے قریب بیٹھ گئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ چرواہے آتے ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پلا کر لے جاتے ہیں۔ لیکن دو لڑکیاں ہیں جو اپنی بھیڑوں کو لئے پیاؤ سے ایک طرف کھڑی ہیں۔ پیاسی بھیڑیں لپک کر پانی کی طرف جانا چاہتی ہیں لیکن وہ انہیں بار بار روکتی ہیں کہ وہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔ حضرت موسیٰؑ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ اپنے جانوروں کو اس طرح روک کیوں رہی ہیں؟ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا آپ نے ان سے پوچھا کہ ان کا ماجرا کیا ہے۔ وہ اپنے جانوروں کو پانی تک کیوں نہیں پہنچنے دیتیں۔ قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ ؕ (28/23)۔ انہوں نے کہا کہ جب تک یہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر لے جائیں، ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ ہمارے گھر میں کوئی زور آور ہے نہیں۔ ہم کمزور لڑکیاں ہیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اس لئے پیاؤ پر کمزوروں کے جانوروں کی باری اس وقت آسکتی ہے جب طاقتوروں کے جانور سیر ہو کر چلے جائیں۔ آخر میں تلچھٹ ہمارے مویشیوں کے حصے میں آجائے گا! حضرت موسیٰؑ نے ایک سرد آہ بھری اور دل میں کہا کہ مصر کو چھوڑا تھا کہ وہاں حق و انصاف کے بجائے قوت و استبداد کا دور دورہ تھا۔ جی میں تھا کہ ایسی سرزمین میں جا بسوں جہاں کمزوروں کو ستانے والا کوئی نہ ہو لیکن — ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست — یہاں حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ آپ اٹھے فَسَقَىٰ لَهُمَا ثُمَّ تَوَلَّىٰ إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ؕ (28/24)۔ ان لڑکیوں کے جانوروں کو پانی پلایا اور پھر سایہ میں آکر بیٹھ گئے۔ اور اپنے خدا سے عرض کیا کہ (اس دنیا میں تو ہر جگہ دھاندلی ہی دھاندلی ہے)۔ اب تیری طرف سے میری بہتری کے لئے جو کچھ بھی آئے میں اس کا محتاج ہوں۔

مدین کا پیاؤ

اس کے بعد جب آپ فرعون کی طرف گئے تو اصل مسئلہ ابھر کر سامنے آگیا۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ (43/46)۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنے واضح احکام دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ میں اس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام اقوام عالم کا

نشو ونما دینے والا ہے۔" یوں دیکھنے میں تو یہ بات "معصوم" سی نظر آتی ہے لیکن فرعون کی نگہ دور رس نے فوراً بھانپ لیا کہ خدا کی ربوبیتِ عالمینی پر زور دینے سے حضرت موسیٰؑ کا مقصود کیا ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً پوچھا کہ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ (۲۶/۲۳) "رب العالمین کون ہے؟" قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (۲۶/۲۴)۔ موسیٰؑ نے کہا کہ رب العالمین وہ ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کا۔ اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سب کا پالنہار ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو تو اس کی ربوبیتِ عالمینی ہر جگہ نظر آجائے گی۔

دربارِ فرعون پھر حضرت موسیٰؑ نے اس کے درباریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۶/۲۶)۔ تمہارا نشو ونما دینے والا بھی اور تمہارے آباؤ اجداد کا نشو ونما دینے والا بھی۔

اس اجمال کی تفصیل میں انھوں نے کہا کہ

اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝ .... (۲۰/۵۳-۵۴)

(میرا رب) وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونے کی طرح بچھا دیا۔ نقل وحرکت کے لئے اس میں راہیں نکال دیں۔ آسمان سے پانی برسایا۔ اس کی آبپاشی سے قسم قسم کی نباتات پیدا کی تاکہ تم اسے خود بھی کھاؤ اور اپنی مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ سوچو! کہ اس حقیقت میں عقل وفکر سے کام لینے والوں کے لئے کیسی کھلی نشانیاں ہیں۔

جب فرعون نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ رزق کے سرچشمے انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر ان کے حقیقی مالک خدا کی طرف لوٹا دیئے جائیں تاکہ ان سے نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کا مقصدِ عظیم پورا ہو تو اس نے اس کی روک تھام کی تدابیر سوچنی شروع کیں۔ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ (۷۹/۲۳-۲۴) اس نے جگہ جگہ لوگوں کو اکٹھا کر کے منادی کرانی شروع کی کہ لوگو! میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں۔ موسیٰؑ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ تمہارا نشو ونما دینے والا کوئی اور ہے۔ وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اس نے اعلانات پر اعلانات شروع کر دیئے کہ لوگو! اس شخص کے فریب میں نہ آجانا جو کہتا ہے کہ وسائلِ رزق خدا کی ملکیت ہیں، ان پر کسی انسان کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔ تم بتاؤ کہ کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں؟ اور کیا یہ نہریں، جو میرے زیرِ اقتدار بہ رہی ہیں، میری ملکیت نہیں؟

کیا تم سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝ (۴۳/۵۲) کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں اس سے کہیں بہتر ہوں۔ یہ کمزور اور ذلیل سا انسان جسے کھل کر بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ (۴۳/۵۳) "اگر یہ خدا کا فرستادہ اور ایسا عظیم تھا تو اسے سرداری کے نشانات کیوں نہ دیئے گئے۔ اس کے جلو میں فرشتے کیوں نہ اتارے گئے؟" اس نے یہ پراپیگنڈا اس زور شور سے کیا کہ قوم کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہ رہی۔ پراپیگنڈا سے مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ عوام کو ایسا (HYPNOTISED) کر دیا جائے کہ وہ نہ اپنے کانوں سے سنیں، نہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں، نہ اپنے دل و دماغ سے سمجھیں۔ قرآن کریم میں ہے فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ (۴۳/۵۴) اس نے اس طرح قوم کو عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا، اور وہ اس کی اطاعت کرنے لگ گئے۔

آپ نے غور کیا کہ یہاں بھی کشمکش وہی تھی جسے ہم اس سے پہلے داعیانِ انقلاب خداوندی اور ارباب دولت و اقتدار کے مابین دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن کریم نے فرعون کے علاوہ دینِ خداوندی کے ایک اور مخالف کا بھی

قارون

ذکر کیا ہے جو دنیا میں آجتک نظامِ سرمایہ داری کے نمایندہ کی حیثیت سے متعارف ہے۔ یعنی قارون۔ فرعون تو پھر بھی بنی اسرائیل پر ظلم و ستم کرتا تھا جو غیر قوم کے افراد تھے لیکن قارون خود بنی اسرائیل میں سے تھا اور انہی کا خون چوستا تھا۔ سرمایہ پرستی میں "معبود" پیسہ ہوتا ہے جو اپنے اور بیگانے میں قطعاً تمیز نہیں کرتا۔ قارون نے بے حد و شمار دولت جمع کر رکھی تھی اور اس کا اسے گھمنڈ تھا (۲۸/۷۸)۔ اس کی قوم نے اس سے کہا کہ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ ۡ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۸/۷۷)۔ جو کچھ تجھے خدا نے دے رکھا ہے، اسے محض اپنی طبیعی زندگی تک ہی محدود نہ رکھ۔ اس سے مستقبل کی زندگی کی سرفرازی کی بھی جستجو کر۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم تارک الدنیا ہو جاؤ۔ دنیاوی زندگی میں بھی اپنے حصے کا خیال رکھو لیکن اسے مقصود و منتہیٰ نہ بنا لو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے تمہیں اتنا کچھ دے کر تمہاری ہر طرح کی کمی پوری کر رکھی ہے اسی طرح تم دوسرے انسانوں کی کمی پوری کرنے کی فکر کرو اور دولت کو ایک جگہ اکٹھا کر کے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے درپے نہ ہو۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کے رُو سے بڑی ہی ناپسندیدہ ہے۔

اس نے یہ سنا اور نہایت طنز آمیز لہجہ میں کہا کہ تم نے یہ کیا کہا کہ مجھے خدا نے یہ کچھ دے رکھا ہے؟ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸)۔ یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنرمندی کی بدولت ملا ہے۔ اس میں خدا کا کیا ہے جو میں اسے اس کے قوانین کے مطابق صرف کر دوں؟

آپ نے غور کیا کہ قارون کا یہ جواب کس طرح اُس ذہنیت کی آئینہ داری کر رہا ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جس طرح اس کشمکش میں فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا اسی طرح قارون اور اس کی دولت بھی زمین میں دھنس گئی۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝ (۲۸/۸۱) سو ہم نے اسے اور اس کی محل سرائے کو زمین میں دھنسا دیا پھر نہ تو کوئی جماعت ایسی ہوئی جو قانونِ خداوندی کے خلاف اس کی مدد کر سکتی اور نہ ہی وہ اپنی تدابیر سے اپنی ہی کچھ مدد کر سکا۔

تمام انبیاء کی مخالفت

یہ ہے دینِ خداوندی کے مخالفین کا وہ پہلا گروہ جس کا قرآن نے تفصیلی ذکر مختلف اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں متعدد مقامات میں کیا ہے اور جس کے متعلق اجمالی طور پر کہا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ (۳۴/۳۴-۳۵)

اور ہم نے کسی بستی میں بھی اپنا پیغامبر نہیں بھیجا جس نے ان لوگوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا ہو اور وہاں کے دولتمند طبقہ نے اس سے یہ نہ کہا کہ جو دعوت تم لے کر آئے ہو ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس اس قدر دولت ہے اور ہمارے خاندان کے افراد بھی اتنے زیادہ ہیں پھر کون ہے جو ہم پر گرفت کر کے کوئی آفت لا سکے۔

یعنی قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا کی دعوت جب اور جہاں بھی آئی۔ سرمایہ دار طبقہ نے سب سے پہلے اس کی مخالفت کی۔ اور مخالفت دلائل و براہین کی بنا پر نہیں، بلکہ محض اپنی دولت اور قوت کے گھمنڈ پر کی یہی کچھ انبیائے سابقہ کے ساتھ ہوا اور یہی کچھ خدا کے آخری نبیؐ، اور کائنات کے عظیم القدر داعیٔ انقلابؐ حضور رسالتمآبؐ کے ساتھ۔ یہاں بھی مخالفت اسی گروہ کی طرف سے شروع ہوئی جس کے گھر دولت سے بھرے ہوئے تھے۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝ (۳۸/۶) ان میں سے اکابرینِ قوم کہنے لگے کہ چلو اپنے معبودوں کی پرستش پر ثابت قدمی سے جمے رہو۔ یقیناً یہ کوئی سوچی سمجھی اسکیم ہے (جس کی رو سے) یہاں کوئی عظیم انقلاب لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اسی طبقہ کا وہ نمائندہ تھا جس کی شدید مخالفت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہا کہ تم اس کی چیرہ دستیوں اور

نبی اکرمؐ

وسیسہ کاریوں سے مت گھبراؤ۔ ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۙ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ۙ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ۙ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ۙ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ؕ (۷۴/۱۱-۱۶)
یہ وہ شخص ہے کہ جب یہ پیدا ہوا تو ساتھ کچھ نہیں لے کر آیا تھا۔ پھر ہم نے اسے بڑی کثرت سے مال و دولت دیا۔ اور وہ بیٹے دیئے جو (امیرزادوں کی طرح) ہر وقت گھر میں بیٹھے گٹھ جوڑ کرتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ ہم نے اس کے لئے زندگی کی آسائشوں کے راستے ہموار کر دیئے۔ لیکن اس کی ہوس کی تسکین نہ ہوئی اور یہ چاہتا ہے کہ ہم اسے اور زیادہ دولت اور قوت دیتے چلے جائیں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ یہ اس دولت اور قوت کو ہمارے قوانین کے مطابق صرف کرنے کے بجائے، اُلٹا ان کی مخالفت پر اُتر آیا ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اسے ہمارے قانون مکافات کے حوالے کر دو۔ وہ اس سے خود نپٹ لے گا۔

قریش کو تنبیہ ان مترفین قریش کے متعلق، جو اپنی دولت کے نشہ میں بدمست، اس انقلابی دعوت کی اس طرح مخالفت کرتے تھے کہا کہ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ کیا ان لوگوں نے ادھر اُدھر چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جن قوموں نے ان سے پہلے ایسی روش اختیار کی تھی ان کا انجام کیا ہوا؟ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا۔ وہ قومیں قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ ان کی زمینیں اُن سے زیادہ پیداوار دیتی تھیں۔ ان کی آبادیاں ان سے زیادہ معمور تھیں۔ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ؕ ان کے پاس ان کے رسول واضح قوانین خداوندی لے کر پہنچے۔ (انھوں نے ان کی بات نہ مانی اور اپنے جرائم کی پاداش میں تباہ و برباد ہو گئے) یاد رکھو۔ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ؕ (۳۰/۹)۔ خدا نے انھیں یونہی ناحق تباہ نہیں کر دیا۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو تباہ و برباد کیا۔

دوسری جگہ ہے وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِیْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِیْنَ ۝ (۲۸/۵۸) ان سے کہو کہ ذرا تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ کتنی بستیاں ایسی تھیں جو اپنی معاشی فراوانیوں پر اس قدر نازاں تھیں۔ سو دیکھو! یہ ان کے مکانات ہیں جو، معدودے چند کے علاوہ، ان کے بعد آج تک آباد نہیں ہوئے۔ اور ان سب کے وارث اور مالک ہم ہی ہو گئے۔ سو جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، وہی کچھ ان کے ساتھ ہوگا۔ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۲۱)۔ اس کا قانون یہی ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرنے والوں کی کھیتیاں کبھی پروان نہیں چڑھا کرتیں۔

اور دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ مترفین بھی بالآخر تباہ و برباد ہوئے۔ وَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (۱۱۱/۲)

اس گروہ کا مال و دولت اور کسب و ہنر ان کے کسی کام نہ آسکا۔

دوسرا گروہ

دینِ خداوندی کے مخالفین کے گروہ اول کے کوائف آپ کے سامنے آگئے۔ یہ گروہ ان سرمایہ پرستوں کا ہے جن کے انسانیت سوز معاشی نظام کے خلاف آسمانی دعوت ایک کھلے ہوئے چیلنج کا حکم رکھتی ہے۔

دینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرتا اور دلائل و براہین کی تائید سے منواتا ہے۔ وہ عقل و فکر کو دعوت دیتا اور غور و تدبر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ دعوت ان لوگوں کے مفاد کے خلاف جاتی ہے جو عوام کی جہالت اور توہم پرستیوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں بلکہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے، آنکھیں بند کرکے، اس پر چلتے جائیں۔ لہٰذا اس گروہ کی طرف سے بھی دینِ خداوندی کی سخت مخالفت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس گروہ کا ذکر بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ حسبِ معمول اس کشمکش کی ابتداء حضرت نوحؑ کی دعوت سے کرتا ہے۔

قومِ نوحؑ

انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۵۹)۔ اے میری قوم! تم اللہ کی مملکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴)۔ ہم نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی۔ اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی انھوں نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس میں ہمیں فلاں غلطی یا سقم نظر آتا ہے۔ کہا یہ کہ جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو، وہ راستہ ہمارے اسلاف کے راستے کے خلاف ہے، اس لئے ہم اسے اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ آپ سے یہ کہا اور عوام میں مشہور کر دیا کہ (معاذ اللہ) اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو یہ اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ (۲۳/۲۵)۔ انھوں نے کہا کہ یہ شخص پاگل ہو گیا ہے۔ سو تم کچھ دنوں تک انتظار کرکے دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے فَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ (۵۴/۹)۔ لوگوں میں مشہور کر دیا کہ یہ پاگل ہے۔ اور پھر اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے، اسے ڈانٹ کر نکال دیا۔

حضرت ہودؑ حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ آتے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنی قوم کو خدا کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں انھوں نے بھی یہی کہا کہ اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (۷/۷۰)۔ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے خدا کی عبودیت اختیار کریں۔ اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے؟ حضرت ہودؑ نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ علم و بصیرت اور عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْ اَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۷/۷۱) جن چیزوں کی بنا پر تم مجھ سے جھگڑتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ چند نام ہیں جو تم نے یا تمہارے بزرگوں نے وضع کر رکھے ہیں۔ ان کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے ان چند الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے؟ وہ کہتا ہے، اس طبقہ کے ہاں جس چیز کو روایتی عظمت اور موروثی تقدیس کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتداء میں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا اور اسے کسی کی طرف منسوب کر دیا۔ جب وہ دو چار نسلوں تک متوارث آگے بڑھا تو وہ نام اس قدر مقدس ہو گئے کہ ان کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہ رہا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ کسی عقیدہ یا روش کے صحیح ہونے کی یہ تو کوئی دلیل نہیں، سوال یہ ہے کہ اسے خدائی سند بھی حاصل ہے یا نہیں؟

حضرت صالحؑ حضرت ہودؑ کے بعد، قوم ثمود کی طرف حضرت صالحؑ تشریف لائے۔ انھوں نے بھی وہی دعوتِ خداوندی پیش کی۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا۔ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا (۱۱/۶۲)۔ انھوں نے کہا۔ اے صالحؑ! پہلے تو تو ایسا آدمی نہیں تھا۔ تجھ سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن اب یہ ایک دم تجھے کیا ہو گیا کہ اَتَنْهٰنَا اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا۔ تو ہمیں ان کی محکومی و اطاعت، بھگتی اور پرستش سے روکتا ہے جن کی پرستش و اطاعت ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَا اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۱۱/۶۲)، جس بات کی طرف تم دعوت دیتے ہو اس کی صداقت میں ہمیں بڑا شک ہے۔ وہ ہمارے دل میں اترتی نہیں، ہم اس کے سوا اور کیا سمجھیں کہ اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (۲۶/۱۵۳)۔ تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو تو اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔

معمارِ حرم

حضرت صالحؑ کے بعد ہمارے سامنے معمارِ حرم، حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ جلیلہ آتا ہے۔ بُت پرستی ان کی قوم کا شعار تھا۔ انھوں نے اس کے خلاف دعوتِ توحید دی۔ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۲۱/۵۲)۔ انھوں نے اپنے والد اور قوم سے کہا کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم اس طرح جمے بیٹھے ہو؟ خدا کا نام تو ایک طرف، کیا تمہیں اپنے مقام کا بھی کچھ اندازہ نہیں؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا۔ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ (۲۱/۵۳)۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم بھی انہی کی تقلید کر رہے ہیں۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۲۱/۵۴)۔ یقین جانو۔ تم اور تمہارے آباؤ اجداد، سب کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ (۲۶/۷۵-۷۶)۔ انھوں نے کہا کہ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جن چیزوں کی تم اور تمہارے آباؤ اجداد پرستش کرتے ہو ان کی حقیقت کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ مذہب کے معاملات ہیں۔ ان سے غور و فکر کا کیا واسطہ؟ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ (۲۶/۷۴) ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا کہ وہ ایسا کیا کرتے تھے۔ ہم بھی ویسے ہی کرنے لگ گئے۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے ان "مقدسین" کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا اور کہا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے یہ مسلک کیوں اختیار کر رکھا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ جو مسلک تمہارے اسلاف سے چلا آ رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور جن معبودوں کی تم ان کے نام کی نسبت سے پرستش کرتے ہو ان کی حیثیت کیا۔ لیکن اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۲۹/۲۵) ان کی وجہ سے تمہارا جتھہ قائم رہتا ہے۔ اور جتھہ کے قائم رہنے سے تمہیں دنیاوی مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہے سارا راز اس تقدیس و تعظیم کا۔ آپ نے غور کیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو واشگاف کیا ہے؟

جب اُن "مقدسین" کے طائفہ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ان کی تقدیس کے پردے چاک ہو رہے ہیں تو انھوں نے قوم کے جذبات کو بھڑکایا۔ اس کی قوم کی طرف سے اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ (۲۹/۲۴) انھوں نے عوام سے کہا کہ ابراہیم کو مار ڈالو۔ اسے زندہ جلا دو۔ حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝ (۲۱/۶۸)۔ اگر تم میں کچھ بھی ہمت ہے تو اسے جلا دو اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کرو۔

کوئی دلیل نہیں۔ کوئی برہان نہیں۔ بس عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا اور خوش ہو لئے کہ ہم نے

میدان مار لیا ہے۔

حضرت شعیبؑ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ہمارے سامنے حضرت شعیبؑ آتے ہیں۔ انھوں نے بھی وہی دعوتِ خداوندی پیش کی اور اس کے جواب میں، ان کے سامنے بھی وہی مسلکِ استدلال کی "دلیل" لائی گئی۔ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (۱۱/۸۷)۔ انھوں نے کہا کہ اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ تم ہم سے آکر کہو کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ (معاذ اللہ) تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ (۲۶/۱۸۵)، تم پر کسی نے جادو ٹونہ کر دیا ہے۔ جاؤ! اپنا علاج کراؤ۔

حضرت موسیٰؑ کشمکشِ کلیمی و فرعونی میں یہ چیز ایک اور ہی پہلو سے سامنے آتی ہے جس سے نظر آتا ہے کہ ملوکیت کی دسیسہ کاریاں اپنی مطلب برآری کے لئے کیا کیا حربے اختیار کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اَنْ) اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۝ (۲۶/۱۷)۔ بنی اسرائیل کو اپنی حکومتی زنجیروں سے آزاد کر کے، ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ بھیج دے۔

فرعون نے پہلے تو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اور ہی نہج سے گفتگو شروع کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس طرح وہ قابو میں نہیں آسکتے تو اس نے ایک اور تدبیر سوچی۔ فرعون کے اردگرد اس کے امراء اور وزراء اور دیگر سردارانِ قوم جمع تھے۔ وہ قوم خود بھی مشرک تھی اور اس کے آباؤ اجداد بھی باطل پرست تھے۔ فرعون کو اس کا اچھی طرح علم و احساس تھا کہ ان کے متعلق حضرت موسیٰؑ کا خیال کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے جھٹ سے پہلو بدلا اور حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یہ باتیں تو بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (۲۰/۵۱) جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں، وہ کس حال میں ہیں؟ یعنی ان لوگوں کے آباؤ اجداد جنت میں ہیں یا جہنم میں؟

سوال آپ نے دیکھ لیا اور یہ بھی بھانپ لیا کہ فرعون کا اس سے مطلب کیا تھا؟ لیکن اُسے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اُسے معاملہ کس شخص سے پڑ رہا ہے! وہ خدا کے پیغمبر تھے۔ انھوں نے کہا قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ان کا علم میرے رب کے پاس نوشتہ کے اندر ہے۔ ان کا معاملہ میرے ساتھ نہیں۔ خدا کے ساتھ ہے اور خدا وہ ہے کہ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی (۲۰/۵۲)۔ نہ وہ غلطی کر سکتا ہے اور نہ ہی کچھ بھول سکتا ہے اس لئے اس بات کو چھوڑ دو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں؟

جب فرعون نے دیکھا کہ اس کا یہ تیر بھی خطا گیا تو اس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ آپ کی دعوت کا تعلق مذہب

سے ہے، سیاست سے نہیں۔ اس لئے کہ آپ بار بار خدا کو بیچ میں لا رہے ہیں۔ لہٰذا آپ کا مقابلہ، ہماری مملکت کے (HEAD PRIEST) ہامان کے ساتھ ہوگا۔ چنانچہ ہامان، اپنے تمام لاؤ لشکر سمیت مقابلہ کے لئے آیا۔ اس نے قوم کے جذبات اسلاف پرستی کو مشتعل کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا (۱۰/۷۸)۔ کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راستے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو؟ انہوں نے یہ کچھ کہا اور ادھر فرعون نے اہلِ دربار میں یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (۲۶/۲۷)۔ یہ جو تمہاری طرف پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہے، یہ (خاکم بدہن) پاگل ہے۔

اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت!

حضور خاتم النبیینؐ

اب آپ اس دَور کی طرف آیئے جس میں خدا کا آخری پیغام، ہر قسم کی غلامی کے لئے پیامِ مرگ بن کر آیا تھا۔ جو دعوت حضرت نوحؑ سے لے کر مختلف انبیائے کرام کی وساطت سے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی تھی، اسے اس کی مکمل شکل میں، نبی اکرمؐ نے پیش کیا۔ اور اس گروہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اس مخالفت کی "دلیل" بھی وہی تھی۔ یعنی مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷)۔ ہم نے اسے پچھلے مذہب و ملت میں کہیں نہیں سنا۔ یہ محض بنائی ہوئی بات ہے یعنی سچی بات وہی ہوگی جو اس روش کی تائید کرے جو اُن کے اسلاف سے متوارث چلی آ رہی تھی۔ جو بات اس روش کے خلاف ہوگی وہ وضعی اور جھوٹی ہوگی۔ جب نبی اکرمؐ اپنی قوم کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کرتے تو یہ گروہ آگے بڑھتا اور لوگوں سے کہتا کہ مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُكُمْ (۳۴/۴۳)۔ اس شخص کا ارادہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جن چیزوں کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں، تمہیں ان سے روک دے۔ اس لئے تم نے اس کی کوئی بات نہ ماننا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر کسی نے ایک مرتبہ اس پیغامِ خداوندی کو دل کے کانوں سے سن لیا، تو وہ اس کی صداقت کا قائل ہو جائے گا۔ اس کے لئے وہ اپنے متبعین کو تاکید کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶)۔ تم نے اس قرآن کو ہرگز نہ سننا۔ جہاں بھی پیش کیا جا رہا ہو، تم شور مچا دو۔ نہ خود سنو، نہ کسی اور کو سننے دو۔ بس یہی ایک طریقہ ہے جس سے اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ تم اس آواز کو دبا سکو۔ قرآن، کریم بار بار اس حقیقت کو دہراتا ہے کہ وہ لوگ، اس پیغامِ خداوندی کی مخالفت کسی دلیل و برہان کی بناء پر نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف یہ کہہ کر کرتے تھے کہ یہ ان کے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کی پیروی کرو جسے خدا نے نازل کیا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے"۔ اور قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰) خواہ ان کے اسلاف نہ کچھ عقل و فکر رکھتے ہوں اور نہ ہی صحیح راستے پر چل رہے ہوں، یہ پھر بھی انہی کا اتباع کرتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اسلاف پرستی کی ذہنیت اسے تسلیم کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتی کہ ان کے آباؤ اجداد عقل و فکر نہیں نہیں رکھتے تھے یا غلط راستے پر چلتے تھے۔ غلط اور صحیح راستے پر چلنے کا امتیاز تو وہ کرے جو اپنی عقل و فکر سے کام لے۔ جب انہیں عقل و فکر سے کام لینے کے لئے کہا جاتا تو ان کا وہی ایک جواب ہوتا کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲) ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔ ہم نے جس طریقہ پر اپنے اسلاف کو پایا ہے ہم اسی پر چلتے جائیں گے۔ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۵/۱۰۴) ہمارے اسلاف کا طریقہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اس پر پھر قرآن یہ کہتا کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۵/۱۰۴)۔ خواہ تمہارے اسلاف کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہی خدا کے تجویز کردہ راستے پر چلتے ہوں، تم پھر بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے جاؤ گے؟ ان کے پاس اس کا جواب (معاذ اللہ) گالیوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ (خاکم بدہن) "پاگل ہے" (۱۵/۶)۔ اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ (۱۷/۴۷)۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ۔ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (۲۱/۵)۔ یہ اُس کے خواب و خیال کی باتیں ہیں، اس کے من گھڑت دعوے ہیں۔ محض شاعری ہے۔ یہ کذاب ہے (۳۸/۴)۔ یہ جہاں کوئی بات کرے، اس کا مذاق اڑاؤ۔ (۲۱/۳)۔ لوگوں سے کہو کہ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا (۲۵/۴۱)۔ ذرا دیکھنا! یہ ہے وہ جو کہتا ہے کہ مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟

یہ ہے وہ انداز مخالفت جو حق و صداقت کی آواز کے خلاف، اس گروہ کی طرف سے اختیار کیا جاتا رہا ہے — ہر زمانے میں اور ہر مقام پر۔

مترفین کے دونوں گروہ

دینِ خداوندی کے مخالفین کے دونوں گروہ آپ کے سامنے آ گئے۔ ایک گروہ سرمایہ داری کا جو دولت کی بنا پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو عوام کو جہالت کی تاریکیوں سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ قرآن کریم نے ان دونوں کو مترفین کہہ کر پکارا ہے یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر خوش حال اور تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں چنانچہ ان میں سے پہلے گروہ کے متعلق کہا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ٥ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۔ (۳۴/۳۴-۳۵)

اور ہم نے کسی بستی میں بھی کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر اس کے مترفین نے یہ کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اتنا بڑا قبیلہ اور جتھہ۔ ہمارے پاس اس قدر مال و دولت۔ ہمیں کون سزا دے سکتا ہے۔

یہ سرمایہ داروں اور اربابِ اقتدار کا طبقہ ہے۔ دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ٥ (۴۳/۲۳)

اور اسی طرح (اے رسول!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر وہاں کے مترفین نے کہا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریقہ پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔

اس مخالفت کا مطلب

واضح رہے کہ اسلام سرمایہ داری کی مخالفت کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ یہ بھک منگوں، سادھوؤں، سنیاسیوں، تارک الدنیا راہبوں، مفلسوں، ناداروں، فاقہ کشوں کا مذہب ہے۔ اسلام، کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرنے کی تعلیم دیتا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ ان قوتوں کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن وہ دولت کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ نہ افراد کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ دولت جمع رہتی ہے اور نہ ہی کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا ہے۔ وہ ایسا نظام متشکل کرتا ہے جس میں وسائلِ رزق، نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت (پرورش) کے لئے وقف ہوتے ہیں، یہی وہ نظام ہے جس کی مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے۔

دوسری طرف جب وہ گروہ ثانی کی مخالفت کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جو کچھ چلا آ رہا ہے اس کی محض اس بنا پر مخالفت کر دی کہ وہ پیچھے سے متشکل ہو کر کیوں آ رہا ہے! وہ اس ضمن میں جو کچھ کہتا ہے وہ اسکے ایک نکتہ میں نہاں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ...... جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کا اتباع کرو جو خدا نے نازل

کیا ہے تو یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ جو کچھ تمہارے آباؤ اجداد سے منتقل ہو کر آیا ہے اسے مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو جو اس پر پورا اترے اسے قبول کر لو۔ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دو۔ قرآن کریم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر نسل اپنے اعمال کی خود ذمہ دار ہے، اس لئے ہر وہ روش جس میں اس ذمہ داری کو دوسروں کی طرف منتقل کرنے کا رجحان پایا جائے اس کی رو سے غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر دور کے افراد سے ان کے آباؤ اجداد کے متعلق کہدیا کہ تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ۔ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ۔ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (۲/۱۳۴)۔ یہ لوگ اس دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے جو تم کرو گے اس کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی۔ تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا، یہ قطعاً نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباؤ اجداد نے کیا کیا اور کیا کہا تھا۔ لہٰذا تم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکو گے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرتے رہے اس لئے ہم اپنے کئے کے ذمہ دار نہیں۔ جو کچھ تم کرو گے، اس کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی۔ اس لئے تمہیں خود سوچنا چاہیئے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ کتاب اللہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ قرآن کریم کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ہر شخص پرکھ سکے کہ اس کا عمل اس کے مطابق ہے یا نہیں۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی

علمی اور تاریخی کاوشوں کا شاہکار

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد عثمانی نے اردو زبان میں منتقل کیا

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب آفتاب اسلام کی

جلوہ باریوں نے بزم انسانی کو منور کیا

ضخامت نو سو صفحات ——— قیمت آٹھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

بابُ المراسلات

حضرت ابراہیمؑ کے (معاذ اللہ) جھوٹ

لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ پاکستان ٹائمز میں ایک صاحب نے لکھا کہ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ اس کے جواب میں مفتی ..... صاحب نے لکھا کہ اس کا ثبوت خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ یہ پڑھ کر میرے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ آپ کچھ اس پر روشنی ڈالیں گے؟

طلوعِ اسلام۔ ہم اس (اور اس قسم کی کئی اور احادیث) کے متعلق کئی بار لکھ چکے ہیں اس لئے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی قسم کی حدیثوں کے صحیح ہونے کا تو انکار ہے جس کی وجہ سے ہمیں منکر حدیث اور منکرِ شانِ رسالت قرار دیا جاتا ہے! قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (۱۹/۴۱) "یقیناً وہ مجسم سچائی تھا اور اللہ کا نبی تھا"۔ لیکن اگر قرآن کریم میں ان کے یا کسی اور نبی کے متعلق اس صراحت سے یہ کچھ نہ بھی لکھا ہو تو بھی ایک نبی کی صداقت میں ذرا سا شبہ بھی ایمان ختم کر دیتا ہے۔ یہ نبی کی صداقت ہی تو ہے جس کی بنا پر اس کے دعویٰ نبوت کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خدا کے ایک جلیل القدر نبی (حضرت ابراہیمؑ) نے جھوٹ بولا تھا اور اس کا ایک برگزیدہ نبی (رسول اللہ) اس کی تصدیق کرتا ہے تو اس آسمان کے نیچے ہم صداقت کہاں ڈھونڈتے جائیں گے؟

اس قسم کی روایات کی حقیقت کیا ہے، اس کے متعلق ہم ایک نامور اہلِ حدیث عالم کی رائے پیش کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اپنی تفسیر ترجمان القرآن جلد دوم (صفحہ ۲۹۹) پر اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اگرچہ صحیحین کی اس روایت کی توجیہ و تاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھول ہیں مگر صاف بات وہی ہے جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ہے اور جسے امام رازی نے بھی دہرایا ہے۔ یعنی ہمارے لئے یہ تسلیم کر لینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر حدیث میں غلطی ہو گئی بہ مقابلہ اس کے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کر لیں۔ اگر ایک راوی کی جگہ سینکڑوں راویوں کی روایت بھی ناقص ٹھہر جائے، تو بہرحال غیر معصوم انسان کی غلطی ہوگی۔ لیکن اگر ایک معصوم پیغمبر کو بھی غلط بیان تسلیم کر لیا گیا تو نبوت و وحی کی ساری عمارت درہم برہم ہو گئی

بلاشبہ روایت صحیحین کی ہے لیکن اس تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے بھی راویانِ حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ نہ امام بخاری و مسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے کسی روایت کے متعلق بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے وہ اس کی "صحت" ہے "عصمت" نہیں ہے۔ اور "صحت" سے مقصود صحتِ مصطلح فن ہے، نہ کہ صحت قطعی اور یقینی مثل صحت قرآن۔ اس ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں، بہرحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لئے مفید حجت ہو سکتا ہے مگر یقینیات و قطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جب بھی ایسا ہوگا کہ کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعیہ سے معارض ہو جائے گی تو یقینیات اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔ غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

نبی کا سب سے بڑا وصف جو قرآن نے بتایا ہے وہ اس کی سچائی ہے۔ اور احتیاج تفصیل نہیں۔ نبوت ایک سیرت ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا مگر اس بات سے کہ جھوٹ نہ بولے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے خواہ کسی شکل اور کسی درجہ میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر نبوت ہوگی تو سچائی بھی ہوگی۔ اگر سچائی نہیں ہے تو نبوت بھی نہیں۔ پس انبیاء کرام کی سچائی اور عصمت یقینیاتِ دینیہ و نقلیہ سے ہے۔ روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں۔ اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔

یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اور یہ مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا۔ نہ زمین شق ہو جائے گی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

(صحیحین کے متعلق) جو کچھ ہے ان کی صحت کا اعتقاد ہے یعنی ایسی صحت کا جیسی اور جس درجہ کی صحت ایک غیر معصوم انسان کے اختیارات کی ہو سکتی ہے عصمت کا اعتقاد نہیں ہے۔ اور اس لئے اگر کوئی روایت شاذ[1]، یقینیات قطعیہ قرآنیہ سے معارض ہو جائے گی تو ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی تضعیف میں تامل نہیں کریں گے کیونکہ اصل ہر حال میں قرآن ہے جس کا تواتر یقینی اور جس کی **قطعیت** شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ہر انسانی شہادت اس پر کسی جائے گی۔ وہ کسی غیر معصوم شہادت اور رائے پر کسا نہیں جا سکتا۔

غرض اندر میاں سلامت اوست

<u>طلوع اسلام</u>: اگر آپ اس اقتباس کو کسی مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیں یہ بتائے بغیر کہ اس کا مصنف کون ہے، تو وہ جھٹ سے کہہ دیں گے کہ یہ وہی منکر حدیث طلوع اسلام ہے!

بہرحال حدیث اور قرآن کے باہمدگر معارض ہونے کے سلسلہ میں جو اصول مولانا آزاد (مرحوم) نے بیان کیا ہے، اگر ہمارے علمائے کرام اسے تسلیم کر لیں تو امت کی کتنی مشکلات حل ہو جائیں۔ دین سے متعلق کتنے جھگڑے چُک جائیں۔ اور غیر مسلم آئے دن جو ناموس رسالتمآب پر (معاذ اللہ) طعن کرتے ہیں اس کا دروازہ کس حسن و خوبی سے بند ہو جائے۔ لیکن ضد تعصب اور گروہ بندی کا کیا علاج!

[1] ہر روایت جو قرآن کریم سے معارض ہوگی، خود بخود شاذ کے ذیل میں آ جائے گی "طلوع اسلام"

ضرورت
مقام حدیث (جلد اول) اگر کوئی صاحب دے سکیں تو حسب ذیل پتہ پر وی۔ پی فرما دیں۔ بڑی نوازش ہوگی۔
ملک حنیف وجدانی پیشنل سیداں۔ ڈاکخانہ موہڑہ سیداں تحصیل مری

علم اور عقل کی روشنی میں

قرآن کریم کو سمجھنے کیلئے پرویز صاحب کی کتابوں سے بہتر آپ کو کوئی لٹریچر نہیں مل سکے گا۔ ہمارے زمانہ میں ان کی یہ کوشش منفرد ہے۔ مثلاً

اسلامی معاشرت — بچوں، عورتوں، کم تعلیمیافتہ لوگوں کیلئے زندگی کے روزمرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کریم کے احکام۔ قیمت ۲/- روپے

نظامِ ربوبیت — قرآن کا معاشی نظام جو سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم دونوں کو مٹا کر ایک جنت کا نما معاشرہ قائم کرتا ہے۔ قیمت ۶/-

من و یزداں — خدا پر ایمان کے کیا معنی ہیں۔ خدا کا قرآنی تصور کیا ہے؟ انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ قیمت ۱۰/-

ابلیس و آدم — انسان کی پیدائش کا آغاز۔ قصۂ آدم کا مطلب۔ ابلیس، شیطان، جن، ملائکہ، وحی، رسالت کا قرآنی مفہوم۔ ۸/-

جوئے نور / **برقِ طور** / **شعلۂ مستور** — حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کے انبیائے کرامؑ اور ان کی قوموں کی سرگذشت۔ تاریخ کے عبرت انگیز حقائق۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب ہر دو جلد ۹/

معراجِ انسانیت — سیرت نبی اکرمؐ قرآنی آیات کی رو سے مرتب کردہ ۸۰۰ صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی کتاب۔ قیمت ۲۰/-

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا اطمینان بخش جواب۔ موجودہ زمانہ کی علمی تحقیقات کی روشنی میں۔ عجیب و غریب مجموعہ۔

تین جلدوں میں۔ پہلی جلد کی قیمت ۸/- آٹھ روپے۔ دوسری جلد کی قیمت چھ روپے تیسری جلد ۹/

طاہرہ کے نام خطوط — عورتوں کے متعلق سوالات کے جوابات۔ قرآن کریم کی روشنی میں۔ دو جلدوں میں۔ اول ۲/- دوم ۲/۸/-

انسان نے کیا سوچا؟ — دو ہزار سال کی انسانی فکر کی تاریخ۔ کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اس قسم کی کتاب نہیں ملے گی۔ قیمت ۱۲/- بارہ روپے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی اور ان کے تصورات کا مفہوم، مستند کتب لغت اور قرآن کریم کی رو سے۔ اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل انسائیکلو پیڈیا۔ چار ضخیم جلدوں میں۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت ۱۵/- پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد ۱۲/- بارہ روپے

(محصول ڈاک بذمہ خریدار)

ملنے کا پتہ: **میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور**

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب

اقبالؒ

احتساب

(۲)

سابقہ اشاعت کے "احتساب" میں طلوع اسلام کی وہ کڑی تنقید قارئین کے سامنے آچکی ہے جو مرکزی حکومت کے زیر اہتمام ایک ادبی ماہنامہ ــــ "ماہِ نو" ــــ کے اجراء پر "طاؤس و رباب اوّل" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ یہ مرحلہ ایک نوزائیدہ مملکت کی تاریخ میں بڑا ہی نازک تھا اور اگر ہمارے ارباب اقتدار کے دلوں میں ان کٹھن ذمہ داریوں کا احساس زندہ ہوتا جو انہیں درپیش تھیں تو وہ اپنی زخم خوردہ ملت کی خون پسینے کی کمائی اس قسم کی "ادبی عیاشیوں" میں ضائع کرنے کے بجائے فرض شناسیوں سے کام لیتے۔

ایک قوم اور لیکن ابھی "ماہِ نو" منظرِ اشاعت پر آیا ہی تھا کہ مغربی پنجاب کے "نیرونما" کارفرماؤں نے بھی قدم آگے بڑھایا اور عوام کے قومی خزانے سے ایک رقم خطیر ہفتہ وار "استقلال" کے اجراء کے لئے وقف کر دی۔ قومی صورتِ حال کی اس قیامت میں جو چاروں طرف برپا تھی حکومت کے یہ اللے تللے طلوعِ اسلام کے لئے کیونکر قابلِ برداشت قرار پاتے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں "مصرعِ ثانی" کے عنوان سے اس نے لکھا۔

> مرکز کی دیکھا دیکھی اب مغربی پنجاب بھی ایک جریدہ لے کر بیٹھ گیا ہے۔ یہ اقدامات افسوسناک ہی نہیں، شرمناک بھی ہیں۔ کیا مرکزی اور صوبائی حکومتیں یہ سمجھتی ہیں کہ وہ سرکاری خزانوں کی بلا شرکت غیرے مالک ہیں؟ کیا ان خزانوں پر ان کا تصرف انہیں یہ حق بخشتا ہے کہ وہ شخصی اور استبدادی قوتوں کی طرح رعایا کا خون چوستی رہیں۔ اور اس خون سے اس قسم کی ذہنی تفریحات کا سامان بہم پہنچائیں؟ جمہوری حکومت کے مدعی اور نمایندے

ہونے کی حیثیت سے وہ قوم کے سامنے جواب دہ ہیں۔ قوم کا حق ہے کہ وہ اس اسراف کا جواز معلوم کرے اور عدم جواز کی صورت میں باز پرس کرے۔ یہ صحیح ہے کہ قوم میں وہ قوتِ محاسبہ مفقود ہے جس نے حضرت عمرؓ ایسے صاحبِ قوت و عظمت کا دامن کھینچ لیا تھا اور ان سے برسرِ عام جواب طلب کر لیا تھا۔ ..... ہم دورِ عمرؓ سے زمان و مکان کے لحاظ سے ہزار فرسنگ دور ہیں۔ لیکن یہ دور آ کر رہے گا۔ حکومت کو جاننا چاہیئے کہ روزوں کے لئے چٹائیاں اور لوٹے مہیا کرنے سے اسلامی نظام رائج نہیں ہو جاتا اور نہ "محکمہ احیائے ملتِ اسلامیہ" کے قیام سے مطلوبہ فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ نظامِ اسلامی ایک ہمہ گیر فضا کا نام ہے اور اس میں حکومت صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ انسان انسان پر حکمران نہیں رہتا۔

(طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۳)

اس تنقید کے آخر میں اس نے اربابِ حکومت کو ان کی "قومی منزل" کے متعلق خبردار کرتے ہوئے لکھا۔

(قومی) منزل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا استحکام بغرض قیامِ حکومتِ خداوندی ہو۔ اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے جس قدر روپیہ بھی صرف کیا جائے بجا اور برمحل ہوگا۔ اس کے لئے قوم کے دل و دماغ کی تعمیر صحیح خطوط پر ہوگی۔ اور ادبِ صالح کے ذخائر سے قوم کا سینہ مالا مال ہو جائے گا۔

لیکن یہ تو وہ کرے جس کی نگاہوں کے سامنے کوئی منزل اور سینہ میں اس منزل کے حصول کی تڑپ ہو۔ یہ ان کے بس کی بات نہیں جن کی ساری زندگی "طاؤس و رباب" کی چلتی پھرتی تصویر ہو۔ (طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۳)

یومِ حساب ۵ر جولائی ۱۹۴۸ء کو ملک غلام محمد (مرحوم) نے (بحیثیت وزیر مالیات پاکستان) لنڈن میں ایک اخباری بیان کے ذریعے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ظالمانہ سازشوں کو پہلی بار بے نقاب کیا اور ثابت کیا کہ تقسیمِ ہند کے موقع پر لاکھوں مسلمانوں کا قتلِ عام اسی ظالم کی منشاء سے بروئے کار آیا تھا۔ اسلامیانِ پاکستان میں ان انکشافات کا تاثر عام طور پر یہی تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کے خلاف ان کی منافرت مزید شدت اختیار کر گئی۔ لیکن "طلوعِ اسلام" کے سامنے اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ خود ہماری قوم کے ان غم گساروں نے قوم کو ان حالات سے بے خبر کیوں رکھا؟

"قوم پوچھتی ہے" کے عنوان سے اس نے ملک موصوف اور مرکز کے دیگر کارفرماؤں سے باز پرس کرتے

ہوئے لکھا۔

قوم اپنے لیڈروں سے پوچھتی ہے کہ جب آپ کو اتنے وثوق سے اس کا علم ہو چکا تھا کہ اتنا عظیم خطرہ مسلمانوں کے سر پر منڈلا رہا ہے اور آپ کو اس کا بھی علم تھا کہ مؤنٹ بیٹن مسلمانوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کرے گا، بلکہ شاید وہ اس سازش میں خود شریک ہے، تو آپ نے اپنی قوم کو اس قتل و غارت گری سے بچانے کے لئے کیا انتظامات کئے؟ کیا ان حالات میں، آپ کا فریضہ محض اس قدر تھا کہ آپ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے تحفظ امن کا مطالبہ کرتے؟..... آپ ماؤنٹ بیٹن کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے تو کیا آپ سوئے قوم آکر قوم کو آنے والے خطرات سے آگاہ نہیں کر سکتے تھے؟ اسے اس کے لئے تیار نہیں کر سکتے تھے؟ یا اسے حالات سے آگاہ کر کے یہ موقع نہیں دے سکتے تھے کہ وہ از خود اپنی حفاظت کے سامان کرے؟ جب تک قوم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا وہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں بالکل حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کے تمام قتل و غارت کا ذمہ دار، قومی نقطۂ نگاہ سے، نہ ماؤنٹ بیٹن ہے، نہ مرکزی حکومت ـــــ بلکہ اس بے گناہ دریائے خون کی ساری ذمہ داری، ان رہنمایانِ قوم کے سر ہے جنھوں نے خطرے کو بھانپا لیکن قوم کو بے خبر رکھا جنھوں نے سیلابِ بلا امنڈتے دیکھا لیکن قوم کو آگاہ کرنے کے روادار نہ ہوئے.....

آپ نے تو ماؤنٹ بیٹن کا دامن حریفانہ کھینچا ہے اور اسے مورد الزام قرار دیا ہے اور قوم آپ کا دامن کھینچتی ہے۔ اور لاکھوں مظلومین کے بے گناہ خون کی دہائی دیتی ہے اور یہ پوچھتی ہے "بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ" ذبح ہونے والی مائیں، بے آبرو ہونے والی بہنیں، نیزوں کی انیوں سے چھدنے اور پتھروں پر پاش پاش ہو جانے والے بچے، کرپانوں سے شہید ہونے والے نہالانِ ملت جو موت کی مہیب اور پُرسکوت وادی میں جھونک دیئے گئے ہیں، ان کی معصومیت و مظلومیت کپکپی پیدا کرنے اور نہ تھمنے والی چیخ کی صورت میں ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ تاریخ کا مکبر الصوت اس چیخ کو "صورِ قیامت" میں بدل دے گا اور یہ "مُردے" زندہ ہو کر پوچھیں گے:

قصاص خونِ تمنا کا مانگئے کس سے گنہگار ہے کون اور خون بہا کیا ہے؟

قوم حق بجانب ہے کہ لیڈروں کے اعتراف کے پیشِ نظر ان سے کہے کہ

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

(طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۴۸ء ـــ صفحہ ۴۷-۴۸)

شانِ بے نیازی آگے بڑھئے! اگلی اشاعت (ماہ نومبر) میں "پاکستانی افسر" کے عنوان سے اربابِ اقتدار کی شانِ بے نیازی کی تصویر حسبِ ذیل الفاظ میں سامنے آتی ہے۔

اربابِ اقتدار کی "دُور باشی" نے ابھی تک عوام کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ملک کی عنانِ اقتدار فی الواقع اپنوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔۔۔۔۔ قیامت یہ ہے کہ خود حکومت کی مشینری کے مختلف پُرزوں میں ربط باہمی مفقود ہے۔ ماتحت و افسر کا امتیاز پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ محترم وزیرِ اعظم کے بہ تکرار اعلانات کے باوجود ان افسران کی شانِ حاکمیت میں کوئی فرق نہیں۔ ان کی سیرت میں بدلے ہوئے حالات نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

(طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۴۸ء ـــ صفحہ ۴۹)

قومی بارگاہ میں جواب دیجئے دسمبر کے شمارہ میں مجلس دستور ساز کے ارکان کا محاسبہ کرتے ہوئے بایں الفاظ خطاب کیا گیا ہے:

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے بنیادی سوال، تدوینِ آئین کا تھا، تاکہ یہ سرزمین بے آئین نہ رہنے پائے۔

یہ تھا وہ اہم فریضہ جو آپ حضرات کے سپرد کیا گیا۔

کیا قوم آپ سے باادب پوچھ سکتی ہے کہ آپ نے اس فریضہ کی انجام دہی میں اس وقت تک کیا کیا؟ اور اگر کچھ نہیں کیا تو آپ کے پاس کوئی معقول وجہ بھی ہے؟

معاف فرمائیے، اگر آپ میں تدوینِ آئین کی اہلیت نہیں تو کھلے بندوں اس کا اعتراف کیجئے اور یہ فریضہ دوسروں کے سپرد کیجئے جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔

اگر آپ میں اہلیت ہے لیکن محض اپنے تساہل یا تغافل کی وجہ سے، آپ اس فریضہ کو سرانجام نہیں دے رہے، تو یہ تغافل مجرمانہ ہے۔ اس کی جوابدہی کے لئے کسی عدالت کے کٹہرے میں آجائیے۔ (طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۸ء ـــ صفحہ ۱۲)

صدر دستوریہ کی بوالعجبیاں

۱۶ دسمبر ۱۹۶۱ء کو مجلس دستور ساز پاکستان کے صدر نے ایوان دستوریہ میں جو تقریر کی اس میں انھوں نے اسلامی دستور کی تشکیل کے قومی مطالبہ کے متعلق بڑا "ندامت آمیز" سا انداز اختیار کیا اور دستوریہ کے ہندو ارکان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ کہا کہ اس قومی تقاضے کو پورا کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ آئین وسیع المشرب (COSMOPOLITAN) ہونا چاہیئے۔ مملکت کے اس منصب عظیم سے اس قسم کا اعلان، ایسی مرعوبیت کا مظہر تھا جس کی روادار غیرت اسلامی قطعاً نہیں ہو سکتی چنانچہ طلوعِ اسلام نے اپنے "لمعات" میں اس پر سخت تنقید کی، اور اسلامی نظام کی ضرورت و اہمیت کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے لکھا:۔

> ہم حیران ہیں کہ بالآخر اس قسم کی ذہنیت کو کیا کہا جائے؟ ہمیں حیرت ہے کہ ہمارے محترم ارباب بست وکشاد کو ہو کیا گیا ہے؟ کیا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کے ایمان کا تقاضا نہیں؟ کیا ان کا مسلمان کہلانا اس دعوے کی دلیل نہیں کہ ان کا ضابطۂ حیات وہی ہونا چاہیئے جس کی طرف نسبت رکھنے سے یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؟ ..... محترم صدر صاحب کے یہ الفاظ فی الحقیقت ایک تاسف انگیز نفسیاتی کیفیت کا مظاہرہ ہیں۔ مسلمان کچھ اس طرح انگریز (اور اس کے بعد ہندو) سے مرعوب ہا ہے کہ اُسے اپنے دعوئ اسلام کو بے دھڑک پیش کرنے میں ایک جھجک سی محسوس ہوتی ہے ..... کیفیت یہ ہے کہ اپنی آزاد سلطنت ہے۔ اس سلطنت کا آزاد دارالخلافہ ہے۔ اس دارالخلافہ میں آزاد مجلس آئین ساز ہے۔ اس مجلس آئین ساز کا آزاد صدر ہے لیکن جذبۂ مرعوبیت اسقدر غیر شعوری طور پر اعصاب پر مستولی ہے کہ یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اور صاحب صدر ہندو ارکانِ اسمبلی سے جھجکتے، سہمتے، لرزتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ قوم ہمیں مجبور کر رہی ہے اس لئے ہمیں اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے ورنہ ہم اس قسم کی "فرقہ وارانہ تنگ نظری" کی ذہنیت نہیں رکھتے کہ پاکستان کے لئے مذہبی نظامِ حکومت کا خیال تک بھی دل میں لائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم اس باب میں کس قدر مجبور ہیں۔

اور اس موضوع کا اختتام ان الفاظ پر ہوا۔

> کیا اچھا ہوتا اگر وہ (صدر دستوریہ) اس باب میں خاموشی سے کام لیتے اور اس طرح جاننے والوں کی نگاہوں میں اپنا بھرم بنا رہنے دیتے۔ اور نہ جاننے والوں کی نظروں میں اسلام

کی رسوائی کا موجب نہ بنتے لیکن اس واقعہ کا دکھ اتنا ہی نہیں اصل دکھ یہ ہے کہ یہ صاحب اس مجلس کے صدر ہیں جس سے ہماری یہ توقعات وابستہ ہیں کہ وہ ہمارے لئے اسلامی آئین مرتب کرے گی۔

مری اس سادگی پر رحم کھانا ۔۔۔ کہ تم سے آرزوئے دل بیاں کی

(طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۴۹ء ۔ صفحہ ۹-۱۰)

یہ مردنی کیوں؟ اسی شمارہ میں پاکستان کی پہلی سالگرہ کی تقریب پر عوام کے جذبات و حیات کی ترجمانی کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

"قائدین ملت اور ارباب حکومت نے، عموماً طور پر، مابعد تقسیم جس عدم تدبر اور اکثر مواقع پر بے حسی کا ثبوت دیا، اس سے ہر شخص نالاں تھا۔ آزادیٔ پاکستان کے ساتھ ہی جس لاقانونیت نے سر اٹھایا تھا وہ اس حد تک بڑھی کہ خود ان لوگوں کے دلوں سے بھی "قانون کا احترام" اٹھ گیا جن پر قانون کو منوانے کی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ رشوت ستانی، ناجائز خویش نوازی، ادائیگی فرض میں کوتاہی، یہ وہ جرائم تھے جو انصرام ملکی کے بیشتر شعبوں میں داخل ہو چکے تھے۔ غیر مسلم بنیوں کی جگہ لینے والے مسلمان بنیوں نے (الا ماشاء اللہ) چور بازاری، ناجائز نفع بازی، اور ذخیرہ اندوزی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ضروریاتِ زندگی کی غیر معمولی گرانی اور نایابی نے "قدیم پاکستانیوں" میں بھی ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ الغرض ہر شخص غیر مطمئن اور شاکی تھا۔ بے اطمینانی اور بے چینی کی اس فضا میں جشنِ پاکستان منایا گیا۔ ایسے مواقع پر پیشتر ازیں جو قدرتی اور بے ساختہ جوش و خروش ہوا کرتا تھا وہ اب کے نمایاں طور پر مفقود تھا۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے والے بھی پرُے ضرور موجود تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نعرے اعماقِ قلب سے نہیں اٹھ رہے۔ ان نعروں میں پہلی سی بیباکی نہ تھی۔ لہٰذا ان سے رگوں میں وہ پہلی سی حرارت بھی پیدا نہ ہوتی تھی۔

(طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۴۹ء ۔ صفحہ ۵)

اس پژمردگی کی وجہ کیا تھی؟ طلوعِ اسلام نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا۔

اس "بے دلی" کی ۔۔۔۔۔۔ دوسری اور اہم وجہ یہ تھی کہ جشنِ پاکستان کی تقاریب سو فیصدی سرکاری تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ عوام و حکام میں اب کوئی فرق نہیں رہا کیونکہ دونوں ملت پاکستان

کے ایجنٹ لائینگ ہیں لیکن عوام کی یہ ذہنی خلش قابلِ فہم تھی کہ وہی حکام جو قیامِ پاکستان تک اس قدر رسوا ہو چکے تھے، اور جن کا نامۂ اعمال قیامِ پاکستان کے بعد بھی بہت زیادہ قابلِ تعریف نہیں رہا، اب پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اور ملت کے وہ غیر سرکاری مخلص خدام جو کل تک جنگِ پاکستان کے کمانڈر تھے، اب پولیس کی لاٹھی کے پیچھے دبکے کھڑے ہیں۔

(طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۴۹ء — صفحہ ۱)

مسلم لیگ کی پرستش کیوں؟

مارچ ۱۹۴۹ء کا طلوعِ اسلام ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ مسلم لیگ کے بعض قدیم منوسلین مسلم لیگ کی عظمت رفتہ کے گن گا گا کر اپنی قیادت کا ڈھونگ رچانا چاہتے تھے۔ ان کے مضحکہ خیز بیانات اور عجیب و غریب مضامین اخبارات میں شائع ہو رہے تھے۔ طلوعِ اسلام، وحدتِ ملت کے قرآنی نقطۂ نظر کے تحت پارٹیوں کو ختم کرنے کا داعی تھا چنانچہ اس نے ان حضرات کی بوالعجبیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے "لمعات" میں لکھا۔

آپ نے دیکھا کہ لیگ کو کس طرح "واجب الاحترام اور قابلِ پرستش" بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب مغربی سیاست کی تقدم بقدم تقلید ہے۔ وہ لوگ "قوم" یا "وطن" کو ایک بت بنا دیتے ہیں۔ اور پھر عوام سے اس کی پرستش کراتے ہیں۔ اور اس سے مقصد اپنی پارٹی کا تحفظ اور پائندگی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں لیگ کا بت بنایا جا رہا ہے ...... لیکن یہ لیگ کیا بلا ہے جس کا تحفظ اور استحکام ہر مسلمان کا ضروری فرض قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ لیگ اس پارٹی کا نام ہے جو زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس پارٹی (یعنی چند افراد) کا تحفظ اور استحکام ملت کا فریضہ بنایا جاتا ہے۔ تحفظ اور استحکام ملت کا ضروری ہے، نہ کہ ملت کی کسی پارٹی کا۔ یاد رکھئے قرآن نے جب فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا تو اس سے مقصود مذہبی فرقے ہی نہیں تھے، سیاسی پارٹیاں بھی تھیں۔ اسلام کے نزدیک پوری کی پوری ملت ایک جماعت ہے۔ ملت کے اندر پارٹیوں کا تصور یکسر غیر اسلامی تصور ہے۔ یہ خالص مغربی سیاست کا تتبع ہے (اور وہ بھی بہت بھونڈی شکل میں) اور ہوسِ اقتدار کی تسکین کا سامان۔ لیگ کی تجدید سے پاکستان میں پارٹی بازی کی لعنت کا جو بیج بو دیا گیا ہے اس کا نتیجہ وہ تشتت اور انتشار ہوگا جو ملک کو جہنم بنا دیگا ...... غور کیجئے کس طرح چند افراد کی ہوسِ اقتدار پوری کی پوری قوم کو جہنم کے گڑھے کی طرف لے جاتی ہے۔

(طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۴۹ء صفحہ ۷)

یہ آزادی!

حصولِ پاکستان کے بعد اخلاقی اقدار کے بندھن کس تیزی سے ٹوٹ رہے تھے اور قومی معاشرہ کیسی اندوہناک آوارگی کا شکار ہو جا رہا تھا اس کا تجزیہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے "مجبوریاں" کے عنوان سے لکھا۔

> جب ہمیں نئی نئی آزادی ملی تو ہماری "اعلیٰ سوسائٹی" کی "بیگمات" ایک دوسری کی دیکھا دیکھی اچھلتی، پھاندتی، ایک دو نہیں، دس بیس قدم آگے بڑھ گئیں۔ مرد خوش تھے کہ "بیگمات" مہذب (UP TO DATE) بن رہی ہیں۔ اب جو ذرا طوفان تھما ہے تو بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا؟ نہ کہیں حیا ہے نہ غیرت، نہ شرم ہے نہ جوہرِ نسائیت۔ گھروں کی جنتیں جہنم میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ اولاد آوارہ ہو رہی ہے۔ سکون و اطمینان مفقود ہو چکا ہے۔ اقتصادی حالت تباہ کن درجہ تک پہنچ چکی ہے۔ وہ صورت آئینہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور چپ ہیں ...... (شمارہ جون ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۵)

لیکن اس نے اپنا فریضہ اسی تنقید تک محدود نہیں رکھا۔ اس نے واضح کیا کہ اس طوفان بدتمیزی کو اس طرح بے لگام چھوڑا نہیں جا سکتا ورنہ اخلاقی اقدار تہس نہس ہو کر رہ جائیں گی۔ اس کا علاج تجویز کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

> اس کا علاج بھی چنداں مشکل نہیں۔ نمائشِ حسن کے جذبہ کی تسکین، دیکھنے والوں کی نگاہوں سے ہوتی ہے۔ آپ اپنی نگاہوں کو روک لیجئے نمائش خود بخود ختم ہو جائے گی۔ کسی ایسے اجتماع میں شریک نہ ہوئیے جہاں عورتوں کی ان بے باکیوں کا مظاہرہ ہو رہا ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ جذبۂ نمائش کس طرح ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے ....
>
> اپنی نگاہ کو روک لیجئے! حسنِ عریاں، جوہرِ مستور بننے پر مجبور ہو جائے گا۔

صوبائی تعصبات

پاکستان کے داخلی استحکام کو اگر کوئی سب سے ہولناک خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو وہ صوبائی تعصبات کا ہے۔ یہی منافرت ہو گی جو ملت کے اجتماعی شعور کو زیر و زبر کر کے رکھ دیگی اور رویئے اخوت کا وہ تصور جس سے اُمت بنیانٌ مرصوص کی حیثیت اختیار کرتی ہے ملیامیٹ ہو جائے گا۔ عظمت ملی کا یہی وہ بنیادی تقاضا تھا جسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے اپنی ہر تقریر اور ہر بیان میں اس تعصب کی پُرزور مذمت کی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد حکومت پاکستان نے خود یہ فیصلہ کر دیا کہ مرکزی ملازمتوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی نیابت الگ الگ ہو گی۔ اور پھر اس کے بعد مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں میں بھی یہی ضابطہ اختیار کر لیا گیا۔ طلوعِ اسلام

نے اس فیصلہ کے خطرناک نتائج کا جائزہ لیا اور اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ صوبائی تقسیم کا وہ شجر ملعونہ جسے انگریز کی حکمتِ فرعونی کا ابلیسی کارنامہ کہا جاتا تھا کس طرح خود اپنے ہاتھوں، اپنے صحنِ چمن میں پیوست کر دیا گیا، اور اس کی آبیاری کیسے ذمہ دار ہاتھوں سے ہوئی۔ یہ تو تھی مشرقی اور مغربی پاکستان کی تقسیم۔ اب آگے بڑھیے حال میں حکومت کے شائع کردہ ایک منشور میں کہا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے حصہ کی اسامیاں پنجاب، سرحد، سندھ، کراچی، بلوچستان، قبائلی علاقہ میں الگ الگ تقسیم کی جائیں گی یعنی! یہ ہے وہ تقسیم جو انگریز کے ملعون عہد میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔۔۔۔ ایک طرف زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ صوبائی ازم ایک خبیث لعنت اور مستقبل میں تشویش انگیز نتائج کا پیش خیمہ ہے اور دوسری طرف اس تعصب کی جڑیں ایسی مضبوط کی جا رہی ہیں جو کسی کے اکھیڑے نہ اکھڑ سکیں۔ معاشرتی زندگی میں صوبائی تعصب، طنز و تشنیع سے آگے نہیں بڑھا کرتا لیکن جب آپ صوبائی حدود کے ساتھ مستقل مفاد وابستہ کر دیں تو یہ وہ ہڈی ہوتی ہے جس پر انسان کتوں کی طرح لڑتے ہیں۔ (لمعات شمارہ ستمبر ۱۹۴۹ء ۔ ص۳)

دیہات کی بیچارگی

پاکستان کی اسی فیصدی آبادی دیہات میں پھیلی ہوئی ہے اور یہ کروڑوں انسان تعلیم علاج اور دیگر ضروریات زندگی کے لئے جس طرح ترس ترس کر دن گزارتے ہیں اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ سیلاب کے طوفانوں میں دیہاتی عوام کو جس تباہی کا شکار ہونا پڑا اور پھر اس سے جو بیماریاں پھیلیں ان کے باعث ان وسیع آبادیوں میں ویرانوں کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ طلوعِ اسلام کی نگہ دوررس نے ان المناک مناظر کا جائزہ لیا۔ دیہاتی عوام کی آہوں اور کراہوں کو دل کے کانوں سے سنا اور پھر اس کے بعد اپنے "لمعات" میں ان کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا۔

قوم پر یہ کچھ گزر رہی ہے اور قوم کی حفاظت و بہبود کے اجارہ دار، یا تو نئی الاٹ شدہ ملوں، فیکٹریوں، اور جائیدادوں کے الٹ پھیر میں مصروفِ تگ و تاز ہیں، یا پھر وزارتوں اور ممبریوں کی دھن میں الیکشن بازیوں اور پارٹی سازیوں کے "جہادِ عظیم" میں مشغول۔ ان کمبختوں کو، زیادہ نہیں تو، قوم کی حفاظت کا اتنا ہی فکر ہونا چاہیئے جتنا قصاب کو اپنی بکریوں کا خیال رہتا ہے۔ انھیں اتنی سوچ بھی تو نہیں کہ اگر قوم اس طرح سسک سسک کر ختم ہو گئی تو پھر یہ کس کے خون پر موٹے ہوں گے؟ یہ تو فرعون سے بھی گئے گزرے ہو گئے کہ

اُسے بنی اسرائیل کی پرورش کا تو خیال رہتا تھا۔ انہیں اپنے سیاسی دھندوں اور روباہ بازیوں سے اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ خود اپنے مستقبل کے مفاد کی بابت ہی کچھ سوچ سکیں اب ہم کس سے جا کر کہیں کہ

از باغباں شد است کہ صیاد آں نکرد

اربابِ نظم ونسق کی بے حسی کا یہ عالم ہے۔ رہنمایانِ ملت کی شقاوتِ قلبی کی یہ کیفیت۔ اس کس مپرسی اور بیچارگی کی حالت میں، بے کس و بے بس انسانوں کا یہ ہجوم، رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک آہ سرد بھر کر بصد حسرت و یاس انتہائی خاموشی سے پوچھتا ہے۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

(لمعات۔ شمارہ نومبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۶۶-۶۸)

قائد آباد کے مہاجرین

دارالسلطنت کراچی میں "قائد اعظمؒ" کے مزار سے ملحق ہزاروں مہاجرین کس طرح اپنے "قائد آباد" کی شکستہ حال جھونپڑیوں میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ کس طرح ان سوختہ سامانوں کی جھونپڑیاں آئے دن بارشوں کے سیلاب میں بہتی نظر آتی تھیں اور کس طرح ان کی زندگیاں غلاظت کے ڈھیروں میں رینگتی پھرتی تھیں۔ حکومت کی نگہ کرم کبھی ان کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ لیکن جب اسی آبادی سے ملحق انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس اور اقتصادی نمائش کا انتظام کرنا پڑا تو اس تباہ حال بستی کے دامن میں دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں روپے کے صرفِ عظیم سے کس طرح ایک ویرانہ خوبصورت سٹالوں سے آراستہ ہو کر جشنِ چراغاں کا منظر پیش کرنے لگا۔ اب وہاں بجلی بھی پہنچ گئی اور پانی کے نل بھی لگ گئے، پارک بھی بن گئے اور عیش و تفریح کے سامان بھی ترتیب پا گئے۔ طلوعِ اسلام نے انسانیت کے اہم تقاضوں کی بجا آوری میں ہر دو متضاد نقوش کو دیکھا۔ سب سے پہلے قائد آباد کی سوختہ سامانی کا نقشہ کھینچا، پھر کانفرنس اور نمائش کی دلفریبیوں کی تصویر پیش کی اور اس کے بعد لکھا۔

> قائد اعظمؒ کے مزار کے ایک طرف اس طرح دولت و ثروت کی نمائش ہو رہی ہے اور دوسری طرف نکبت و فلاکت اور تباہی و بربادی کی نمائش۔ یہ نمائش چند دن کی عارضی ہوگی اور وہ پہلی نمائش اسی طرح بدستور چلی جائے گی۔ اس نئی نمائش میں اسی قوم کی معاشی حالت سدھارنے کی تجاویز پر غور وفکر ہوگا جو دولت و ثروت کی اس نمائش کے عین سامنے سکراتِ موت میں ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔ مرنے والا اسی قسم کی نمائشوں کے داعیان

کے متعلق کہہ گیا تھا کہ

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

(طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۴۹ء۔ صـ۲)

قومی نمائندگی کے اجارہ دار

صوبائی اور مرکزی کارفرماؤں کی سفاک پرستیوں نے ملک میں غربت و افلاس اور بے بسی و بیچارگی کے خراب پھیلا رکھے تھے کہ انہی دنوں مغربی پنجاب میں صوبائی انتخابات کی ہنگامہ آرائیوں کا آغاز ہوا۔ کیمپلپور کے ایک خادم قوم نے اس مرحلہ پر ایک پمفلٹ شائع کیا اور اس میں اعداد و شمار کے باوثوق ذرائع سے یہ تفصیل پیش کی گئی کہ یہ بڑے بڑے جاگیردار جو قوم کی نمائندگی کے اجارہ دار بن کر میدان میں آرہے ہیں کس طرح سابقہ انتخابات میں مسلم لیگ کے قومی فنڈ سے لاکھوں روپے اپنی انتخابی مہم پر بے دریغ صرف کر چکے ہیں۔ طلوعِ اسلام نے قومی زندگی کے اس فیصلہ کن مرحلے پر ان اعداد و شمار کو اپنے کالموں میں شائع کیا اور عوام کو حقیقتِ حال سے خبردار کرتے ہوئے اس ضمن میں لکھا۔

> قرآن، ان انسان نما درندوں کو، جن کے منہ کو آدمی کا نمکین خون لگ گیا ہو "مترفین" کی جامع اصطلاح سے پکارتا ہے۔ ان میں ہر وہ ملعون گروہ شامل ہوتا ہے جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ پیرہن ان کے مختلف ہوتے ہیں لیکن روح ہر جگہ ایک ہی ہوتی ہے فرعونیت (بادشاہت) یا اس کے جانشین، دورِ حاضرہ کی جمہوری قباؤں میں چھپے ہوئے مستبدین۔ ہامانیت، یا اسلامی لیبل لگائے والی ملائیت اور پیریت، قارونیت یا عصر رواں کے جاگیردار، خواتین، کارخانہ دار، زمیندار وغیرہ، یہ سب مترفین ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو انتخابی موسم پر راہنمایانِ قوم کے نگاہ فریب پردوں میں آتا ہے۔ اور عوام کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر، ان کے نمائندوں کی حیثیت سے، اقتدار کی کرسیوں پر متمکن ہو جاتا ہے۔ اور جب تک یہ تمکن قائم رہتا ہے، یہ انہی لوگوں کا خون چوسنے میں مصروف رہتا ہے جن کا نمائندہ بن کر گیا تھا۔
>
> اس مختصر سے پمفلٹ میں اسی گروہ کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور ٹھوس واقعات اور اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے کہ یہ غارت گرانِ متاعِ ملت کس بری طرح اس غریب قوم کو لوٹ کھسوٹ رہے ہیں۔

(طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۶۱ء۔ صـ۴۸)

پاکستان کا نیا کلچر

جشن نوروز (یکم جنوری) کی تقریب پر جس کا تعلق صرف عیسائیوں سے ہے، کراچی کی ایک کلب میں رات کو جو رنگ رلیاں منائی گئیں اور عریانی و فحاشی کے جو شرمناک مناظر بپا ہوئے، اس کی داستان قرآنی نظام کے اس رقیب کو خاموش نہ رکھ سکی۔ "پاکستان کا نیا کلچر" کے عنوان سے اس نے سب سے پہلے اس کلب کی حیا سوز فضا کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھا۔

> فرنگی کا سانپ یہاں سے ڈیڑھائی برس ہوئے نکل گیا، لیکن وہ فرنگیت کی لکیریں یہاں کس گہرائی سے چھوڑ گیا ہے، اس کا اندازہ شراب و شباب کی اس محفل نما آگیں سے لگائیے جو سال نو کی آمد کی خوشی میں، کراچی کے ایک بہت بڑے کلب میں ۳۱ دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب کو انتہائی مستیوں اور رنگینیوں میں ڈوب کر منائی گئی۔ ایک دیدہ ور تماشائی کے بیان کے مطابق عمال حکومت پاکستان کی اکثر بیگمات شفق سامان اور دختران برق وار اس مغربی نیم عریاں لباس میں ساق و سینہ کی ہوش ربا جلوہ پاشیوں کے ساتھ اس محفل رنگ و عطر میں غارت گر ہوش و تمکین بن رہی تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عشائیہ (SUPPER) کے بعد میں نے پینے کے لئے پانی مانگا تو بیرے نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا جو کھلے الفاظ میں کہہ رہا تھا کہ یہ اگلے وقتوں کی بو بہہ۔ یہ روح یہاں کیا کرنے آگئی۔ اس نے کہا حضور! یہاں
>
> شاہد و شمع و شراب و شکر و ناز و سرود
>
> میں پانی کا کیا کام؟ آج رات یہاں پانی کے نلوں سے شراب بہہ رہی ہے۔ اس کے بعد محفل رقص شروع ہوئی ...... ٹھیک بارہ بجے تمام بتیاں بجھا دی گئیں۔ اس اندھیرے میں کیا کچھ ہوا۔ آنکھوں نے تو دیکھا نہیں، البتہ کان اس کی غمازی ضرور کر سکتے ہیں۔ انگریزی کے آئین فحاشی کے مطابق اس اندھیرے میں ہر عورت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جسے چاہے چوم لے .....

اور اس کے بعد طلوع اسلام نے جو کچھ لکھا اس میں وہ عبرت انگیز اور گہری طنز مضمر تھی جو ہر غیور اور مخلص پاکستانی کا دل خون کر دے۔ سنیے!

> ہمارے راوی کا بیان ہے کہ ایک گوشے سے ایک ساغر شکن "چراہٹ" کے ساتھ کسی مرد کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی کہ ـــــ ارے یہ کیا ـــــ؟

اس کے جواب میں، قہقہہ کی بلوریں کھنک سے فضا مرتعش ہوگئی اور ایک شوخ و شنگ آواز نے کہا

یہ پاکستان کا نیا کلچر ہے

(طلوعِ اسلام ۔ جنوری ۱۹۵۸ء ۔ صفحہ ۳)

سوچئے کہ یہ الفاظ کس قدر ہوش ربا طمانچے تھے ان کروڑوں انسانوں کی غیرتِ ملی کے لئے جنہوں نے ایک ارفع و اعلیٰ معاشرتی انقلاب کے لئے اس خطۂ زمین کے حصول میں ہر متاعِ عزیز کی بازی لگا دی تھی۔

یادِ اقبالؒ تصورِ پاکستان کے داعیِ اوّل علامہ اقبالؒ کے یوم وفات کو مرکزی حکومت کی طرف سے جس بے نیازی (بلکہ احسان فراموشی) سے سرکاری تعطیلات و تقریبات میں نظر انداز کیا جا رہا تھا اس پر دوسری بار پھر طلوعِ اسلام کو حکومت کی بے حسی اور بے نیازی کا ماتم کرنا پڑا۔ "۲۱ اپریل" کے عنوان سے اس نے لکھا۔

۲۱ اپریل یعنی علامہ اقبالؒ کا یوم وفات آ رہا ہے ۔ اس مردِ درویش کا یوم وفات جس نے مسلمانوں کو پاکستان کا تصور دیا۔ وہ تصور جس کے متشکل ہونے پر آج سات کروڑ مسلمان انسانی درندوں سے محفوظ و مصئون زندگی گزار رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ دن تیسری بار آ رہا ہے۔ حکومتِ پاکستان نے روزِ اوّل سے ہی اس دن کو نظر انداز و فراموش کر دیا .....
پہلے سال تو خیر حکومت نے بدسلیقگی سے عین آخری وقت پر چھٹی کا اعلان کر دیا لیکن گزشتہ سال اور امسال "نظریہ پاکستان کے لئے مرحوم کے بے مثال عطایا کی یاد" (یہ الفاظ ایک سرکاری اعلان کے ہیں) کو حافظوں سے محو کر دیا اور ان عطایا کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ یوم اقبال مستقل تعطیل قرار پا جائے۔ حالانکہ حکومت نے جنم اشٹمی، دسہرہ، دیپنڈی، شاہِ انگلستان کی سالگرہ وغیرہ ایسے ایام کو عام تعطیلات قرار دے رکھا ہے۔

(مارچ ۱۹۵۰ء ۔ صفحہ ۶)

اور اس کے بعد "شان سے اقبال نمبر" کے سلسلہ میں گورنر جنرل (خواجہ ناظم الدین) کے پیغام کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

ہم گورنر جنرل صاحب کی خدمت میں باادب گزارش کرتے ہیں کہ "اس مفکرِ اعظم کی یاد میں"[1]

---

[1] یہ گورنر جنرل کے پیغام کے الفاظ تھے۔

حکومت جو قلیل سی نذر پیش کر سکتی تھی وہ اس نے نہیں کی اور اقبال کے "پیغام حیات بخش کی یاد کو" اس نے فراموش کر دیا۔ اس احسان فراموشی کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن ہم غالب

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب ۔۔۔ یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

حکومت کو ہر سال اس کی یاد دہانی کرا کر خود شرمسار ہونا نہیں چاہتے۔ (ایضاً)

یہ جذبات فروشی

لیاقت نہرو پیکٹ کے بعد وزیر داخلہ پاکستان کی قیادت میں صحافیوں کا ایک وفد ہندوستان کے خیر سگالی کے دورہ پر گیا۔ اس دورے میں وزیر داخلہ اور ان کے رفقاء اپنی تقریروں میں خیر سگالی کے جوش میں جذباتی طور پر اس قدر بڑھ گئے کہ یہ سب کچھ غیرتِ ملی کے منافی نظر آنے لگا۔ طلوعِ اسلام نے اس قسم کی افسوسناک جذباتی روش کے نفسیاتی اثرات کو بروقت محسوس کیا اور جون ۱۹۵۰ء کے افتتاحیہ (لمعات) میں ایسی نفسیات کا دو ٹوک تجزیہ کرتے ہوئے لکھا۔

مسلمان صحافیوں کا ایک وفد خیر سگالی ہندوستان جا رہا ہے اور اس مقصد کی اہمیت کے پیشِ نظر پاکستان کے وزیر داخلہ ان کے ہمراہ جاتے ہیں۔ یہ اقدام بڑا مستحسن تھا لیکن جذباتی مسلمان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہاں پہنچ کر یہ اس قسم کی تقریریں شروع کر دیتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر ایک ہے۔ ان کے نظریاتِ زندگی میں کوئی تفاوت نہیں۔ اور یہاں تک بھی، کہ مسلم لیگ کی قسم کی "فرقہ وارانہ" جماعتوں سے انہیں کبھی سروکار نہیں رہا۔ کیونکہ شاید وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بُعد اور منافرت کی ذمہ دار رہیں۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے!

یہ وہی جذبات فروشیاں ہیں جو اس سے پیشتر، نہ صرف یہ کہ ہمیں دوسروں کی نگاہوں میں تملق پیشگی کی خفت کا پیکر بنا چکی ہیں بلکہ حقائق سے آنکھیں چرا لینے کی وجہ سے باہمی اتحاد کی کوششوں کو بھی نامراد کر چکی ہیں۔ (شمارہ جون ۱۹۵۰ء ۔۔۔ ص ۵)

نو وارد مہاجرین کا داخلہ

حصولِ پاکستان کے دو ڈھائی سال بعد بھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ہندوستان میں جن مسلمانوں کا جینا دوبھر بنایا جا رہا تھا وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں اس سرزمین پاکستان کا رُخ کر رہے تھے جس کے حصول کے لئے انہوں نے سالہا سال تک جان لڑائی تھی۔ ان حالات میں پاکستان کے وزیر داخلہ نے اپیل کی کہ وہ ترکِ وطن سے احتراز کریں۔ حکومت پاکستان نے یہ بھی

اعلان کیا کہ آئندہ مزید مہاجرین کی آمد کو روکنے کیلئے سرحد کو مسدود کر دیا جائیگا۔ مسئلہ بڑا اہم تھا۔ طلوعِ اسلام نے سنجیدگی سے اسکے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا اور اسی سلسلے میں وہ ایک تلخ حقیقت بھی منظرِ اشاعت پر لایا۔ اس سلسلے میں اس نے لکھا۔

مسئلہ زیرِ نظر کی اہم ترین حیثیت انسانی ہے، آئینی نہیں۔ ہمارے اپنے وضع کردہ آئین قوانین کے تقاضے انسانی تقاضوں پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ ایسا ہے جیسے سیلاب سے بچنے کے لئے اپنے دروازے کے سامنے تو بند باندھ دیا جائے لیکن سرچشمۂ سیلاب کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔

اس کے بعد اس نے ان نو وارد مہاجرین کے گراں قدر پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا۔

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ..... دنیا پر ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانانِ ہندوستان کی غالب اکثریت مطالبہ پاکستان کی موید ہے۔ تشکیلِ پاکستان میں پورا حصہ لینے کے باوجود یہ لوگ ہندوستان میں رہے اور مسلمان ہونے کی پاداش میں جو قیامت بھی ان پر نازل ہوئی اسے برداشت کیا۔ مگر پاکستان پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا۔ ان کے مقابلے میں، ان کے لیڈر جو ہندوستان میں تقسیم کے بعد، بالکل امن و اطمینان سے بیٹھے تھے، نہ ان کے گھر لٹے تھے، نہ جائیں تلف ہوئی تھیں، نہ عصمتیں برباد ہوئی تھیں، غرضیکہ ان کا بال تک بیکا نہ ہوا تھا، انھوں نے جب دیکھا کہ پاکستان میں لوٹ مچ رہی ہے تو وہ دیوانہ وار لپکے اور مسلمانوں کو موت کے منہ میں دھکیل کر پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر انھوں نے ہر چیز کو سمیٹا۔ اس پر قبضہ کیا، اس کو الاٹ کرایا، اسے ہتھیایا۔ چنانچہ اس طرح وہ پاکستان کے اجارہ دار بن بیٹھے قوم کی قربانیوں کا یوں فائدہ اٹھا کر اور پاکستانی مالِ غنیمت کو غصب و ہضم کر کے اب وہ یہاں چودھری بن بیٹھے ہیں اور جو کوئی ہندوستان سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ بیچارہ جان اور آبرو بچانے کے لئے پاکستان کا رُخ کرتا ہے تو یہ چودھری چلا چلا کر اسے کہتے ہیں کہ واپس چلے جاؤ۔ یہاں جگہ نہیں ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ان چلانے والوں کو آخر ان بدقسمت مہاجرین پر کیا فوقیت حاصل ہے؟ اگر ان بھگوڑوں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ مل سکتا ہے تو ان بیچاروں کو کیوں محروم رکھا جائے؟ موجودہ مہاجرین جن پر پاکستان کے دروازے بند کئے جا رہے ہیں، ان کی ہمت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے وحشت اور درندگی کا استقامت سے مقابلہ کیا۔ یہ سخت جان یقیناً اپنے محاذ پر

ٹےرہتے تھے۔ان کی مستضعفین کی سی حالت ان مفرورین ملت نے بنائی۔ وہ قائدین جن کے سہارے پر مسلمانانِ ہندوستان نے جنگ پاکستان لڑی تھی، ایک ایک کرکے پاکستان بھاگ آئے۔ ان کے بھاگ آنے سے جو بھگدڑ مچی اس میں سرفروشانِ ملت پس گئے۔ چنانچہ آج وہ انتہائی بیچارگی اور شکست خوردگی کے عالم میں سوئے پاکستان آرہے ہیں۔ بے یار، بے گھر، بے مقصد، بے امام! ادھر سے ان کو نکالا جارہا ہے اور ادھر سے ان کو دھتکارا جارہا ہے۔ اگر ان کے قائدین اس نفسانفسی کی فضا میں انھیں تنہا چھوڑ کر ہیٹ پا افتادہ مفادات کی طمع میں بھاگ نہ آتے تو ان کے سہارے قائم رہتے اور وہ پیش نظر حوادث و نوازل کا مردانہ وار مقابلہ کرتے۔ جب کوئی للکارنے والا نہ رہا تو ان کے حوصلے ٹوٹ گئے اور اوسان خطا ہوگئے۔

تو کیا ان لوگوں کو، جو ان مظلومین کی مظلومیت کا حقیقی سبب ہیں، یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کی امداد کرنے کی بجائے ان کو ٹھکرا دیں؟ اگر یہ ممکن اور مناسب ہے کہ ان کو پاکستان میں آنے سے روکا جائے اور زبردستی موت کے منہ میں جھونک کر ہندوستان میں رہنے پر مجبور کیا جائے تو کیوں نہ ان سے پہلے ان قائدین کو واپس بھیجا جائے جو ان کی مصیبتوں کے ذمہ دار ہیں؟ ان کے واپس جانے سے ان جانبازوں کے آسرے پھر سے قائم ہوجائیں گے اور ان کے قدم جم جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کریں گے اور اپنی جنگیں خود لڑیں گے۔ (جون ۱۹۵۰ء — صفحہ ۱۲-۱۳)

وزیر خارجہ کا جواب

۵ راگست ۱۹۵۱ء کو بی بی سی اور پاکستان ریڈیو کی لہروں سے، شہرہ آفاق مورخ پروفیسر ٹوئین بی (TOYNBEE) اور چوہدری ظفراللہ خاں، وزیر خارجہ پاکستان، کا باہمی مذاکرہ نشر کیا گیا۔ اس اہم مذاکرہ کی صورت یہ تھی کہ دنیا کا عظیم مورخ سوال کر رہا تھا اور پاکستان کی اسلامی مملکت کے وزیر خارجہ اس کا جواب دے رہے تھے۔ مذاکرہ کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اسلام دنیا کی مشکلات ختم کرنے میں اہم پارٹ ادا کرسکتا ہے اور جس خوبی سے اس نے قومیتوں اور نسلوں کے امتیازات کو مٹایا وہ ایک درخشندہ کارنامہ ہے اور پھر انھوں نے چوہدری صاحب سے سوال کیا پاکستان کاشتکاروں اور زمینداروں کے مسئلہ کو کس طرح حل کرنا چاہتا ہے۔ چوہدری صاحب نے اس اہم سوال کا جو مضحکہ خیز جواب دیا اس کا ماتم کرتے ہوئے طلوعِ اسلام کو "حقائق" کے زیر عنوان

لکھنا پڑا کہ

سوال بڑا اہم تھا۔ براہ راست تھا۔ خود سائل کی شخصیت بڑی ممتاز تھی۔ دوسری طرف مجیب اس اسلامی حکومت کا رکن تھا جسے دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں اسلامی تصورات حیات کی تجربہ گاہ ہے۔ ایک دنیا اس سوال کے جواب کے لئے گوش برآواز تھی ....

آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جواب کیا دیا گیا؟ جواب میں کہا گیا کہ ہاں! ہم نے ہائیڈرو الیکٹرک سکیم بنائی ہے جس سے ہماری انڈسٹریز کو فائدہ پہنچے گا۔ اور انڈسٹری اور زراعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم نے خود زراعت کی ترقی کے لئے بھی کچھ تجاویز سوچی ہیں۔

یہ تھا جواب اس سوال کا کہ اسلام، زمینداروں اور کاشتکاروں کے مسائل کا حل کس طرح کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ آج دنیا کے اہم مسائل میں سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ چوہدری صاحب اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہی نہیں تھے۔ اس لئے کہ ان کے ہاں اسلام کا تصور ایک مذہب کا ہے، دین کا نہیں۔ اور اگر وہ اس کے اہل ہوتے بھی، تو صحیح جواب نہ دے سکتے۔ اس لئے کہ ابھی پچھلے سال ان کے خلیفہ حضرت مرزا بشیر الدین صاحب نے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں اسلام کو ایک خالص سرمایہ دارانہ مذہب ثابت کیا ہے جس میں زمیندار بڑی بڑی زمینداریوں کے مالک ہو سکتے ہیں۔ جب حضرت صاحب کا ارشاد یہ ہو تو چوہدری صاحب اس کے خلاف کس طرح لب کشائی کر سکتے ہیں۔

(ستمبر ۱۹۵۱ء ــــ صـ ۶۳)

اس وضاحت کے بعد اسلام اور پاکستان دونوں کی مظلومی پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

اسلام کی مظلومیت پر غور فرمایئے۔ ایک غیر مسلم، بین الاقوامی شہرت کا مالک، فاضل تاریخ اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ اسلام میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دورِ حاضر کے مسائل کا حل پیش کر سکے۔ اس کے بعد وہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے وزیر خارجہ سے پوچھتا ہے کہ اس خاص مسئلے کا حل اسلام کیا پیش کرتا ہے۔ اور اسے جواب ملتا ہے۔ ہائیڈرو الیکٹرک سکیم! .....

بنا بریں، لندن اور کراچی کے اس سب سے پہلے مذاکرہ کا تجربہ بڑا افسوسناک رہا۔ تمام اقوام عالم تک، اسلام کا صحیح پیغام پہنچانے کا یہ بہت عمدہ موقع تھا۔ افسوس کہ یہ موقع

نہ صرف رائیگاں گیا بلکہ مفکرین عالم کے دلوں پر اسلام کے متعلق ایک غلط نقش قائم کر گیا۔
اگر اس سلسلہ کو جاری رکھنا مقصود ہے تو ہم ارباب حل وعقد سے گزارش کریں گے کہ وہ
ان مذاکرات میں، یا تو اسلام کو خارج از بحث قرار دیں اور اگر اسلام کو بحث میں لانا
ہے تو اس کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کریں جو اس قسم کے سوالات کا صحیح جواب
دینے کے اہل ہوں۔ (ستمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۶۳)

اسلامی اخوت اور سیاسی معاہدے

انہی ایام پاکستان نے مصر اور شام سے یکے بعد دیگرے دو معاہدات (ثقافتی اور تجارتی) طے کئے۔ اس حد تک معاملہ صحیح اور صاف تھا لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ ان معاہدوں پر خوشیاں منائی گئیں اور سرکاری حلقوں میں بالخصوص اس پر اطمینان و مسرت کا اظہار کیا گیا کہ ان معاہدوں کے باعث اب یہ ملک ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور باہمی اتحاد کے امکانات بڑھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ طبعاً طلوعِ اسلام کے لئے بھی ایسے معاہدات قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتے لیکن مسرتوں کے اس ہجوم میں اس کی عقابی نگاہیں تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی دیکھ رہی تھیں اور وہ رُخ اس قدر اہم تھا کہ اس کے اثرات قلب ونگاہ کی گہرائیوں سے پیوست ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنیادی حقیقت کو منظرِ عام پر لاتے ہوئے اس نے "لمعات" میں لکھا۔

یہ کن ملکوں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے؟ مصر، شام، عراق، حجاز، یمن، ایران، ترکی، مراکش، انڈونیشیا اور پاکستان کے متعلق۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان ممالک کے رہنے والے کون ہیں؟ ان سب کے باشندے وہ ہیں جن کا خدا ایک ہے۔ رسول ایک ہے۔ ضابطۂ قانون (قرآن) ایک ہے۔ قبلہ ایک ہے۔ نصب العین حیات ایک ہے۔ مقصدِ زندگی ایک ہے۔ اساسِ فکر ایک ہے۔ بنیادِ عمل ایک ہے۔ جو ایک کے نزدیک ایک حرام ہے وہی دوسرے کے نزدیک حرام ہے۔ جو ایک کے ہاں حلال ہے وہی دوسرے کے ہاں جائز ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ یہ تمام وہ لوگ ہیں جنہیں بنیان مرصوص سے تشبیہ دی گئی تھی یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند..... دو لفظوں میں یوں کہئے کہ یہ وہ ممالک ہیں جن کے باشندوں کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا تھا کہ

یہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

..... یہ وہ رشتہ تھا جس کا اعلان خود خدا نے فرمادیا اور جس کے ایک ایک حرف پر ان سب کا ایمان ہے ..... (دسمبر ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۷)

اس طرح اسلامی رشتۂ اخوت کے تمام گوشوں کی اہمیت تفصیلاً واضح کرنے کے بعد اس اہم افتتاحیہ کے آخر میں اس نے لکھا۔

دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے افراد، جو اپنا منہ قبلہ کی طرف کرتے تھے، باہمی اخوت کے لئے کسی سیاسی معاہدہ کے محتاج نہیں تھے لیکن آج اسی قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے والے، باہمی روابط کے لئے ثقافتی، تجارتی اور سیاسی معاہدات کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ـــــ ظاہر ہے کہ اس دوڑ دھوپ کے محرکات بھی سیاسی ہیں اور اس اتحاد سے مقصود بھی محض سیاسی مفاد کا تحفظ یعنی جذبۂ محرکہ (یا مقصد پیش نظر) یہ نہیں کہ دنیا کے مسلمان پھر سے اس نظام کو قائم کریں جو ان کے دین کا تقاضا ہے .....

اس میں شبہ نہیں کہ اتحاد ایک اچھی چیز ہے لیکن جو اتحاد آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر نہیں بلکہ محض سیاسی مفاد کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو گزشتہ جنگ کے بعد انگلستان اور روس کے اتحاد کا ہوا ..... آج مسلمان اپنی نمازوں میں تو قبلے کی طرف منہ کرتے ہیں لیکن باہمی اتحاد کے لئے "مسلم بلاک" کی اسکیمیں سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ قبلے کی طرف منہ کرنے سے مراد ہی یہی تھی کہ یہ سب ایک ہی بلاک کی اینٹیں ہیں جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد "حرم کی پاسبانی" ہے۔ سیاسی معاہدات نہیں۔ واضح رہے کہ حرم، کعبہ، مکہ سے مراد سعودی حکومت کا دارالسلطنت نہیں بلکہ دین کے نظام کا مرکز ہے جہاں سے قرآنی قوانین نافذ ہوں گے اور جماعت واحدہ کی حکومت واحدہ کا مرکز واحد ہوگا۔ لتکونوا شھداء علی الناس۔ تاکہ یہ مرکز تمام اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی کرتا رہے۔ (دسمبر ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۱)

فکرِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت

(اربابِ بست و کشاد کیلئے لمحۂ فکریہ)

ہماری زندگی میں وہ لمحات بڑے روح نواز اور مسرت آگین ہوتے ہیں جب پاکستان کے کسی گوشہ سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ حکیم انقلاب نے ہمیں پاکستان کا انقلاب آفریں تصور عطا کیا۔ اس کے فلسفۂ حیات کو نئی نسل میں عام کیا جائے۔ پچھلے دنوں (۵ دسمبر کو) کراچی میں اقبال اکیڈیمی کی بجٹ سب کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے تعلیم اور سائنسی تحقیقات کے وزیر محترم اختر حسین صاحب نے بھی اپنی تقریر میں کچھ اسی قسم کے خیالات اور خواہشات کا اظہار فرمایا۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق

> ..... مسٹر اختر حسین نے علامہ اقبال سے متعلق ایسی کتابیں شائع کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو سکول کے بچوں کے لئے موزوں ہوں۔ آپ نے کہا کہ اس طرح نئی نسل کو حکیم ملت کا پیغام اور فلسفہ سمجھنے اور صحیح قومی شعور پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ اقبال اکیڈیمی ایسی کتابیں ایسے مقتدر مصنفوں سے لکھوائے جو بچوں کی نفسیات سے واقف ہوں اور بچوں کے لئے کتابیں لکھنے کے ماہر ہوں..... آپ نے اکیڈیمی کے لئے ایک عمدہ لائبریری قائم کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا تاکہ حکیم مشرق کے کلام اور فلسفہ سے متعلق تحقیق کرنے والوں کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ (نوائے وقت — ۶ دسمبر)

محترم اختر حسین صاحب کے ارشادات یقیناً قابل قدر ہیں اور ان کی تجاویز خلوص پر مبنی لیکن بایں ہمہ ہمیں یہ عرض کرتے ہوئے معاف کیا جائے کہ ہمارے کانوں نے یہ کچھ پہلی بار نہیں سنا۔ نہ ہی اقبال اکیڈیمی ہمارے

لئے کوئی نیا ادارہ ہے اور نہ ہی یہ تجاویز اس ادارے کے لئے کوئی نئی تجاویز ہوں گی۔ ارباب حل وعقد اس سے پہلے بھی، فلسفہ اقبال کے نام پہ بارہا اس قسم کے (بلکہ ان سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر) خیالات کا اظہار فرما چکے ہیں اور دوسری طرف اقبال اکیڈیمی بھی اس سلسلے میں لاکھوں روپوں کی سرکاری امداد کام میں لا چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود فکر اقبال کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں تعمیری طور پر کیا کچھ کیا گیا؟ ہمارا خیال ہے کہ پاکستان میں ہمارا اس سوال کا اطمینان بخش جواب ان اداروں میں سے کسی کے ہاں سے بھی نہیں مل سکے گا جو اقبال کے نام پہ اتنا کچھ کرنے کے مدعی ہیں۔

یہ سوال بڑا اہم ہے لیکن ہمارے نزدیک اس سے کہیں اہم تر ایک دوسرا سوال ہے اور وہ یہ کہ اقبالؒ کے فکر و فلسفہ کی حقیقت اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس سوال کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ فلسفۂ اقبال کی تحقیق و تجسس کے اجارہ دار ہیں ان کی نکات آفرینیوں اور ذوق تجسس کا شاہکار یہ ہے کہ فکر اقبال کو کبھی کانٹ کے فلسفہ کا رہین منت بتایا جاتا ہے، کہیں برگسان کا آئینہ دار، کہیں نیٹشے کے خیالات کا پرتو اور کہیں ہیگل کا خوشہ چین۔ ہم انتہائی دکھ کے ساتھ یہ عرض کریں گے کہ اگر ہماری نئی نسل کو فلسفۂ اقبالؒ کے سلسلے میں اسی قسم کے "تحقیقی شاہکاروں" سے مستفیض کرنا مقصود ہے تو یہ نہ صرف فلسفۂ اقبال سے افسوسناک دشمنی ہوگی بلکہ ملت کے شاہین بچوں پر بدترین ظلم بھی۔ اپنے فلسفۂ حیات کے انہی بر خود غلط اجارہ داروں کے متعلق اس دانائے راز نے کہا تھا کہ

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

یہ افسوسناک کیفیت، اس واضح حقیقت کے باوجود، رونما ہوئی ہے کہ اقبالؒ پکار پکار کر کہتا رہا کہ اس کے فکر و فلسفہ کا سرچشمہ قرآن اور صرف قرآن ہے۔ اس نے اپنے پیش کردہ پورے فکر کا ماخذ بیان کرتے ہوئے ہر قسم کے ظن و تخمین اور شک و شبہ کی جڑ کاٹ دی جب اس نے کہا

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام — شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام
از تب و تابم نصیب خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

اس نے عصر حاضر کے فلاسفہ و مفکرین کی خوشہ چینی نہیں کی بلکہ ان کے فلسفہ و فکر کا طلسم توڑ کر رکھ دیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

طلسم عصر حاضر را شکستم — ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم — بنار او چہ بے پروا نشستم

جو شخص افکارِ مغرب کو آتشِ نمرود قرار دے رہا ہو، اس کے متعلق یہ دور کی کوڑی لانا کہ اس نے فلاں فلاں مفکرینِ مغرب کے فلسفہ سے "فیض" حاصل کیا، کسی لحاظ سے بھی مستحسن اور قابلِ قبول نہیں قرار پا سکتا۔

یہی نہیں، اقبالؒ اس سے بھی آگے بڑھا اور بحضورِ رسالت مآب اس نے اپنی ایک مناجات میں کہا کہ

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

کتنی بڑی سزا قبول کر رہا ہے وہ اس جرم کے لئے کہ اگر اس نے قرآن سے ہٹ کر کچھ کہا ہو تو اسے قیامت کے دن بوسۂ پا سے بے نصیب کر دیجئے۔

وہ نہ صرف فلسفۂ مغرب کے خلاف جنگ کا نعرہ بلند کرتا رہا بلکہ دینِ مُلّا کی خود ساختہ شریعت سے بھی دامن کشاں رہا۔ اس کے اس اعلان پر غور کیجئے۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھکو وہ دل کی موت، یہ اندیشۂ نظر کا فساد

نظامِ حیات میں اس کے سرچشمۂ فکر ــــ قرآن ــــ کو کس قدر بنیادی اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے لگائیے۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ او رحمۃ للعالمیں

اسی سرچشمۂ رحمت سے کسبِ فیض حاصل کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغرِ افگنم

اور پھر اس کا عقیدہ اور ایمان یہ تھا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اپنے سرچشمۂ فکر کے بارے میں، اقبال کے ان بیانات اور واشگاف اعلانات کے بعد اربابِ تعلقہ پر اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ جب فکرِ اقبال کی نشر و اشاعت کا سوال سامنے ہو تو اصل اہمیت اس فکر کے سرچشمہ ــــ قرآن ــــ کو حاصل ہو گی۔ یہ مقصد اس قسم کی کوششوں سے حاصل نہیں ہو گا کہ اقبالؒ کے مسودات اور دستاویزات کسی جگہ بطور یادگار جمع کر دی جائیں اور ان کی بدولت تحقیقی کام کرنے والوں کی ضرورت کو پورا کر دیا جائے۔ ان چیزوں کا اپنا مقام ہے

لیکن اصل مقصود اس فکر اقبالؒ کی عام اشاعت ہے جس کا سرچشمہ قرآن ہے۔

فکر اقبالؒ کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اصل کام یہ ہے کہ اس کی روشنی میں قرآن کے زندہ جاوید حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے اور اس روشنی میں قرآن کی تعلیمات کو نئی نسل میں عام کیا جائے۔ اور یہ کچھ تبرکاً یا قدامت پرستانہ انداز سے نہیں بلکہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ قرآن عصر حاضر کے چیلنج کا کیونکر سامنا کرتا ہے۔ اقبالؒ نے عصر حاضر کے تقاضوں کو قرآن کریم کی روشنی میں سمجھا اور اسی کی روشنی میں آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یاد رکھئے کہ اگر ہم نے یہ کچھ کر دیا تو اقبال کے اشعار ہماری موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوں گے۔ اس کی بدولت قرآن کے عالم آرا حقائق ابھر ابھر کر نگاہوں کے سامنے آتے جائیں گے۔ اور سرزمین پاکستان ان کی روشنی سے جگمگا اٹھے گی۔ یہی تعبیر ہوگی شاعر مشرق کے اس خواب کی جسے دیکھ کر وہ پکار اٹھا تھا کہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

لیکن اگر اس حقیقت کو پیش نظر نہ رکھا گیا اور اس کے بجائے فکر اقبال کے سلسلہ میں وہی کچھ ہوتا رہا جو اس وقت تک ہوتا رہا ہے تو اس سے پاکستان کی تعمیری جدوجہد کا کوئی مقصد حاصل تکمیل کو نہیں پہنچے گا۔ اقبال اکیڈیمی اس وقت تک قومی خزانے سے لاکھوں روپے حاصل کر چکی ہے اور اس حقیقت کا ہم سے زیادہ اسے خود اعتراف ہوگا کہ وہ فکر اقبال کو اس کے سرچشمۂ حقیقی یعنی قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرنے کے سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کر پائی۔ یاد رکھئے جب تک فلسفۂ اقبالؒ کو اس کے سرچشمۂ حقیقی سے مربوط نہیں کیا جائے گا اور نئی نسلوں کے قلب و نگاہ اس فکر و بصیرت سے مستنیر نہیں ہوں گے جس کا سرچشمہ خدا کی آخری اور زندہ و پائندہ کتاب ہے اس وقت تک اقبال اور اس کا فلسفہ ہمارے لئے تقاریر کا موضوع اور نعروں کا سامان تو بن سکے گا لیکن اس سے ان ارفع و اعلیٰ مقاصد کی تکمیل نہ ہو سکے گی جن کے لئے اقبال کی روح ہمیشہ طلسم پیچ و تاب بنی رہی۔ یہی تھی وہ بصیرت قرآنی کی تڑپ اور خلش جس میں اس نے نئی نسل کو پکارا تھا۔

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
اے جوانان عجم جان من و جان شما

مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گذشت
ریختم طرح حرم در کافرستان شما

حلقہ گرد من زنید اے پیکران آب و گل
آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

اور اسی سوز و ساز میں ڈوب کر اس نے ملت کے ان شاہین بچوں کے لئے یہ دعا کی تھی کہ

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

قومی زندگی کا اہم ترین تقاضا آج اقبالؒ کے اسی نورِ بصیرت کو عام کرنے کا ہے۔ اقبالؒ کی یہ تابندہ بصیرت (اس کے اپنے الفاظ میں) قرآن کے سرچشمۂ نور ہی کی رہینِ منت ہے۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن اور اقبالؒ کو ہمارے تعلیمی نظام میں اس حیثیت سے رکھا جائے کہ قرآنی حقائق کی تشریح اقبالؒ کی فکر سے کی جائے اور اقبال کی فکر کو قرآنی حقائق کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اور ان کی راہ نمائی میں ان مشکلات حل دریافت کیا جائے جن میں عہدِ حاضر اس بری طرح گرفتار ہے۔ اگر ہمارے اربابِ بست وکشاد نے فلسفۂ اقبالؒ اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اس حقیقت کو پیشِ نظر نہ رکھا تو اس کا انجام سوائے اقبالؒ کی اس فریاد کے اور کچھ نہ ہوگا۔

آشنائے من ز من بیگانہ رفت — از خستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی او را دہم — تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من — رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بے خوابیٔ جانم ندید — آشکارم دید پنہانم ندید

قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں عصرِ حاضر کے اہم ترین مسائل کا نکھرا ہوا حل

مفکرِ قرآن کا دلنشین اندازِ نگارش

سلیم کے نام خطوط

یہ حقیقت کشا خطوط قلبِ سلیم میں ابھرتے ہوئے سینکڑوں سوالات کا واضح جواب اور نوجوانانِ ملت کے قلب و نگاہ کے لئے ایک صحیح و صالح انقلاب کی جاں نواز تحریک ہیں

جلد اول۔ آٹھ روپے ، جلد دوم۔ چھ روپے ، جلد سوم۔ چھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

رابطہ

(جامع رپورٹ بزم ہائے طلوع اسلام بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۱ء)

۱۔ بورے والا — گذشتہ ماہ اجتماعات باقاعدگی سے ہوتے رہے جن میں لغات القرآن اور مفہوم القرآن کا درس دیا جاتا رہا۔ مفہوم القرآن کے خریدار بنانے کی مہم جاری ہے۔ تقسیم لٹریچر کا سلسلہ باقاعدگی سے قائم ہے۔

۲۔ واہ کینٹ — بزم کی میٹنگ میں مجلس عاملہ کی طرف سے موصول شدہ ہدایات بسلسلہ خریداری مفہوم القرآن کے سلسلے میں یہ طے پایا کہ بزم کا ہر رکن مفہوم القرآن کا سیٹ ضرور خریدے۔ اب تک مفہوم القرآن کی پچیس جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اور مزید دس جلدوں کے لئے آرڈر دے دیا گیا ہے۔ مجلس عاملہ کی طرف سے "القرآن العظیم" پمفلٹ کی جتنی کاپیاں موصول ہوئی تھیں وہ مخلص احباب میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔

۳۔ پنڈ دادن خاں — مجلس عاملہ کی طرف سے موصول شدہ لٹریچر کی تقسیم بدستور جاری ہے جس کے کافی خوشگوار نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ بزم کے روح رواں حافظ عبدالمجید صاحب جو کہ یہاں کے امام و خطیب ہیں، ہر جمعہ کو بعد نماز قرآنی حقائق کو نکھار اور ابھار کر بیان کرتے ہیں جس سے سامعین بڑا خوشگوار اثر قبول کر رہے ہیں۔

۴۔ ڈیرہ غازی خاں — گذشتہ ماہ مفہوم القرآن کے تین مزید خریدار پیدا کئے گئے۔ مزید خریدار بنانے کی مہم جاری ہے۔ توقع ہے کہ اس کے نتائج کافی حوصلہ افزا ہوں گے۔ طے پایا کہ آئندہ اجلاس میں درس

قرآن کا آغاز کیا جائے۔

۵۔ پشاور ٹیپ پر درس قرآن سنانے کا سلسلہ جاری ہے۔ لٹریچر حسب سابق تقسیم کیا جا رہا ہے۔

۶۔ کوئٹہ ماہ نومبر میں بزم کے اجتماعات حسب معمول باقاعدگی سے ہوتے رہے۔ کوئٹہ میں سردیوں کا موسم احباب کی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتا ہے تاہم احباب کی کوششیں کافی خوشگوار نتائج پیدا کر رہی ہیں۔

۷۔ چک جھمرہ بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ لٹریچر کی تقسیم اور حلقۂ احباب کی توسیع پر خاص طور پر توجہ دی جا رہی ہے۔ اجلاس میں درس مفہوم القرآن کا سلسلہ جاری ہے۔

۸۔ راولپنڈی بزم کے ہفتہ وار درس باقاعدگی سے جاری ہیں۔ محترم پرویز صاحب کا درس قرآن حکیم ٹیپ ریکارڈ پر سنایا جاتا ہے جس سے احباب خاصی دلچسپی لے رہے ہیں اور سامعین اور اراکین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ بزم کی رکنیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

۹۔ سرگودھا گذشتہ ماہ اراکین بزم، سب کنونشن منعقدہ سرگودھا کے انتظامی امور میں مصروف رہے جس کے باعث کسی دوسرے کام کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔ اس اہم ذمہ داری سے فراغت کے بعد اب تشہیر و اشاعت کا سلسلہ پھر شروع کر دیا گیا ہے۔

۱۰۔ رسول نگر خان بہادر قاضی حفیظ الدین (مرحوم) کی وفات کے بعد محترم سردار رحمت اللہ صاحب آرضتی بزم کے نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔ خان بہادر مرحوم کے خلف الرشید محترم کرنل قاضی غیاث الدین صاحب نے اپنے والد مرحوم کا قرآنی لٹریچر بزم کو عطا کر دیا ہے تاکہ اس کا افادہ عام ہو جائے۔ نئے نمائندہ محترم سردار رحمت اللہ صاحب نے اپنی ذمہ داریوں کے تحت کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اور اراکین بزم سے اپیل کی ہے کہ قرآنی فکر کی اشاعت میں باہمی تعاون اور سرگرمی کا ثبوت دیں۔

۱۱۔ مری بزم کی لائبریری کے لئے لغات القرآن کا سیٹ حاصل کر لیا گیا ہے۔ "مفہوم القرآن" کی کاپیاں عباسی جنرل سٹور (اپر بازار) نے حاصل کر لی ہے ضرورت مند احباب وہاں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۲۔ شکر گڑھ بزم کا حالیہ اجلاس بڑا کامیاب رہا۔ نمائندۂ بزم نے اپنی تقریر میں سورہ فاتحہ کا مفہوم بیان کیا۔ اور اس عظیم سورہ کی عظمت واضح کی۔ اجلاس کے خاتمہ پر پمفلٹس تقسیم کئے گئے۔

۱۳۔ چک ۲۲۸ ضلع جھنگ مفہوم القرآن کے خریدار بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ تین خریداروں نے ابھی ابھی اس کی خریداری قبول کی۔

نئی بزم کا قیام اور توثیق رحیم یار خاں سے نئی بزم کے قیام کی رپورٹ موصول ہوئی ہے۔ ادارہ بزم مذکور کی توثیق کا اعلان کرتا ہے۔

راولپنڈی کے احباب

نوٹ فرمالیں کہ ہر جمعہ بوقت چار بجے شام بمقام الکوثر بلڈنگ بالمقابل گورنمنٹ گرلز کالج۔ مری روڈ پر محترم پرویز صاحب کا درس قرآن مجید ـــــ بذریعہ ٹیپ ـــــ سنایا جاتا ہے

"بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی"

اَلْفِتْنَۃُ الْکُبْرٰی

مصر کے (نابینا) جید عالم، مورخ، محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا معرکہ آرا کارنامہ جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ قرن اول کی تاریخ کے نازک ترین دور کی تصویر۔ اپنے موضوع پر لاجواب کتاب کا شگفتہ ترجمہ۔ قیمت چھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

نقد و نظر

الاتقان فی علوم القرآن (اردو) دنیا میں مسلمانوں جیسی خوش بخت قوم اور کوئی نہیں کہ ان کے پاس خدا کی کتاب، حرفاً حرفاً اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ یہ سعادت دنیا کی کسی اور قوم کے حصے میں نہیں آئی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی کم الم انگیز نہیں کہ اس قوم نے اپنے اوپر فہم و تدبر فی القرآن کے دروازے کچھ اس طرح بند کئے ہیں کہ ان کے پاس قرآن کے صرف الفاظ ہی محفوظ رہ گئے ہیں، اس کے حقائق و معارف نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے الفاظ میں یہ ہوئی کہ

> چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ، عام شاہراہ، تقلید کی شاہراہ ہو گئی۔ اس داء عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا تھا، کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیریں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۵-۱۴)

نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کریم سے متعلق ہمارے ہاں جو کچھ لکھا گیا، بجز شاذ و مستثنیات، اس کا تعلق، قرآنی حقائق سے بہت کم رہا۔ سارا زور "معلوماتی" قسم کی چیزیں فراہم اور پیش کرنے پر صرف ہوتا رہا۔ اس قسم کی کتابوں

میں، علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" بڑی مشہور ہے۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ مولوی محمد حلیم انصاری (دیوبندی) مرحوم نے کیا تھا جو ۱۹۱۰ء میں دو جلدوں میں شائع ہوا تھا لیکن اب ناپید تھا۔ اسی ترجمہ کو ضروری اصلاح کے بعد، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد زیر تبصرہ ہے۔ اب اردو دان طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے گا۔ کتاب متوسط سائز کے قریب پونے سات سو صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت مجلد بارہ روپے ہے۔ کتاب میں جس قسم کی معلومات ہیں اس کا اندازہ چند ایک عنوانات سے لگ سکے گا۔ مثلاً مکی اور مدنی آیات۔ حضری اور سفری آیات، نہاری اور لیلی آیات۔ صیفی اور شتائی آیات۔ فراشی اور نومی آیات (یعنی آیات کب اور کن حالات میں نازل ہوئیں)۔ اسباب نزول قرآن کی سورتوں، آیتوں، کلمات اور حروف کی تعداد۔ مختلف قراءتیں۔ کتاب کے اس حصہ میں زیادہ تر وہی باتیں ہیں جو ہمارے ہاں کے قدامت پرست طبقہ میں عام طور پر دہرائی جاتی ہیں۔ مثلاً

> قرآن میں بعض سورتیں اور آیتیں اس قسم کی ہیں جن کے ساتھ فرشتوں کی تعداد مشایعت (ہمرکابی) میں نازل ہوئی تھی۔ اس قسم کی سورتوں میں ایک الانعام ہے۔ اس کی مشایعت ستر ہزار فرشتوں نے کی۔ فاتحۃ الکتاب کی مشایعت میں اسی ہزار فرشتے آئے۔ سورۂ یونس کی مشایعت تیس ہزار فرشتوں نے کی۔ سورہ الانعام کا نزول فرشتوں کے جس جلوس کے ساتھ ہوا وہ اتنا بڑا تھا کہ اس نے مشرق سے مغرب تک تمام فضا کو پُر کر دیا تھا (ص ۹۳)

البتہ کتاب کا آخری حصہ جس کا تعلق قرآن کے مفردات (بالخصوص حروف) کے معانی اور مفہوم سے ہے لغوی اور نحوی اعتبار سے مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

کتاب کا مقدمہ، مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، فاضل دارالعلوم، دیوبند نے لکھا ہے جس میں قرآنی معلومات کے متعلق متقدمین اور متاخرین کی تصانیف و تالیفات کا اچھا تعارف آ گیا ہے۔ اگرچہ جہاں تک زیر نظر کتاب کا تعلق ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> ہم نے سیوطیؒ کی تاریخی اور علمی اغلاط سے بحث نہیں کی۔ گو کرنے کا اصل کام یہی تھا۔ مگر یہ فرصت کا کام تھا۔ اور اس کا لطف بھی اسی وقت تھا جب کتاب عربی میں چھپتی۔ اس لئے ہم نے ان چیزوں سے تعرض نہیں کیا۔

لیکن اس علیم الفرصتی کے باوجود انہوں نے ایک کام ضرور کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سرسیدؒ کے پاس ایک شخص آیا اور اس سے کہا کہ میری مالی حالت بڑی سقیم ہے۔

بہت سا قرض سر پہ ہے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ آپ قوم کی مشکلات کا حل سوچتے ہیں مجھے بھی کوئی تدبیر بتا دیجئے جس سے میری یہ مشکل حل ہو جائے۔ سر سیدؒ نے ہنسنا اور اس سے کہا کہ تم ایک کام کرو، میرے خلاف کوئی کتاب شائع کرو، وہ بہت بکیگی اور تمام قرضہ ادا ہو جائے گا۔

معلوم نہیں اُس شخص نے یہ نسخہ آزمایا یا نہیں لیکن آجکل یہ عام چل رہا ہے۔ جو شخص سستی شہرت چاہے یا اپنی کتاب، اخبار یا رسالہ کو زیادہ مقبول بنانا چاہے، اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ پرویز صاحب کی مخالفت میں کچھ لکھ دیا جائے۔ یہی آسان نسخہ مولانا عبدالعلیم چشتی صاحب نے استعمال کیا ہے۔ آپ شاید سوچیں گے کہ سیوطیؒ کی اتقان میں پرویز صاحب کی مخالفت کا کونسا موقعہ اور محل ہو سکتا تھا؟ لیکن جب مقصود مخالفت کرنا ٹھہرا تو اس میں محل اور بے موقعہ کا کیا سوال؟ سنئے کہ اس کی تقریب کیا پیدا کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

> اردو زبان میں وقت کے نامور فاضل مولانا محمد عبدالرشید نعمانی نے اس موضوع پر کم و بیش دس بارہ برس کی محنت کے بعد لغات القرآن حرف عین تک چار جلدوں میں مکمل کی تھی جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ پاکستان میں عہد حاضر کے نامور متجدد غلام احمد پرویز نے بادنیٰ تصرف اس سرمایہ کو اپنی کتاب لغات القرآن میں منتقل کر لیا ہے۔

حالانکہ پرویز صاحب تو ایک طرف ادارہ طلوع اسلام میں سے کسی نے بھی آجتک مولانا نعمانی صاحب کی لغات کی شکل تک نہیں دیکھی۔ چشتی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ حرف عین کے بعد کا حصہ پرویز صاحب نے کس کی کتاب سے منتقل کیا ہے؟

اس کے بعد چشتی صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ پرویز صاحب نے اپنی لغات میں لین اور پطرس بستانی جیسے غیر مسلم مصنفین کی کتب لغت سے استناد کیا ہے۔ پرویز صاحب کی لغات کے مقدمہ میں حسب ذیل ماٰخذ کا ذکر صراحت سے کیا گیا ہے۔

تاج العروس۔ مفردات امام راغب۔ ان دونوں کتابوں کو بنیادی طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔ لین نے تاج العروس پر اپنی بنیاد رکھی ہے۔) مقائیس اللغت (ابن فارس)۔ محیط المحیط (پطرس بستانی) فقہ اللغت (الثعالبی)۔ اقرب الموارد۔ منتہی الادب۔ کتاب الاشتقاق۔ العلم الخفاق فی علم الاشتقاق۔ الالفاظ المترادفہ۔ لطائف اللغت۔ کتاب المعربین۔ البستان۔ کشاف۔ جلالین۔ المنار۔ جمہرۃ اللغت۔ روح المعانی۔ تفسیر قرطبی۔ تفسیر تستری۔ فتح القدیر۔ مفردات (علامہ فراہی) کتاب التسہیل لعلوم التنزیل وغیرہ۔ چشتی صاحب کو ان میں سے صرف لین اور پطرس بستانی دکھائی دیئے۔ بہرحال پرویز صاحب کے خلاف کچھ لکھا گیا۔ اور یہی ان کا مقصود تھا۔ یہ ہمارے ہاں کے علمی طبقہ کی حالت ہے۔ خدا ہم پر رحم کرے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور کی

مطبوعات

راولپنڈی میں { ۱۔ لنڈن بک کمپنی۔ ایڈورڈ روڈ صدر
۲۔ مکتبۂ اخوت۔ جامع مسجد روڈ

پشاور میں ——— ادارہ اشاعت سرحد۔ قصہ خوانی بازار

نوشہرہ میں ——— منظور برادرز۔ صدر بازار

کیمبل پور میں ——— خزینۂ علم و ادب

لائل پور میں ——— دانش کالج۔ ریل بازار

ان کے علاوہ دوسرے شہروں کے تاجران کتب تاجرانہ شرح پر اگر ہماری مطبوعات لینا چاہتے ہیں تو براہ راست ہم سے خط و کتابت کریں

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

بیادِ اسلمؒ

اسبابِ زوالِ اُمّت

(جناب علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوریؒ)

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ کی وفات کو چھ برس ہو گئے ـــــ ان کا انتقال دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہوا تھا ـــــ لیکن انھوں نے ظلمت کدۂ ہند و پاک میں قرآنِ کریم کی جو نورانی شمع اپنے علم و ایمان کی حرارت سے روشن کی تھی، اس کی ضیا باریاں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں، اور اس طرح جریدۂ عالم پر ان کے ثبتِ دوام کی زندہ شہادت ہیں۔ علامہ مرحوم قرآن کریم کے جلیل القدر مفکر اور اسلامی تاریخ کے عالم تھے۔ ہم ان کی یاد میں ان کا ایک ایسا مقالہ شائع کرتے ہیں جس میں ان دونوں گوشوں کا پرتو موجود ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔ طلوع اسلام)

اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے سب سے زیادہ حیرت انگیز امر مسلمانوں کا زوال ہے کیونکہ وہ ایسی سچی اور روشن کتاب کے حامل ہیں جو ان کو نہ صرف آخرت بلکہ دنیا میں بھی ہر قسم کی عزت اور بلندی بخشنے کا اعلان کرتی ہے۔

قرآن کا وعدہ حق ہے کہ مومنوں کے لئے امن ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔ (۶/۸۲)

جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو انھوں نے ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا، ان کے لئے امن ہے اور وہ ہدایت پر ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ عزت مومنوں کے لئے ہے۔

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۶۳/۸)

حقیقت یہ ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومنوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے اور وہی سربلند رہیں گے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۔ (۳۰/۴۷)

اور ہمارے اوپر حق ہے مومنوں کی مدد کا۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ (۱۳۹/۳)

اور نہ سست بنو اور نہ غم کرو حال یہ ہے کہ تمہیں سربلند ہو گے اگر تم مومن ہو۔

قرآن یہ بھی اطمینان دلاتا ہے کہ کفار کو مومنوں پر کبھی غلبہ نہ ہو گا۔

وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۔ (۱۴۱/۴)

اور اللہ کافروں کو کبھی مسلمانوں کے اوپر راستہ نہ دے گا۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومن کفار پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (۲۲/۴۸)

اور جو کفار تم سے لڑیں گے تو وہ پیٹھ پھیر دیں گے پھر نہ کوئی پشت و پناہ پائیں گے نہ کوئی مددگار۔

اور قرآن مومنوں کے لئے روئے زمین کی بادشاہت کا بھی وعدہ کرتا ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ۔ (۵۵/۲۴)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کئے کہ ان کو ضرور روئے زمین کا بادشاہ بنائے گا۔

لیکن ان کے برخلاف صدیوں سے مسلمان ایک مسلسل زوال اور انحطاط کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جو سرعت کے ساتھ ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ بلکہ ان کا بڑا حصہ کفر و شرک سے مغلوب ہو کر محکومیت کے دردناک عذاب میں گرفتار ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے۔ اور ممکن نہیں ہے کہ مومن ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ اللہ اپنے وعدے پورے نہ کرتا، اس لئے کچھ خرابیاں ہمارے ہی ایمان و عمل میں ہیں جن کی وجہ سے ہم اُن کے مستحق نہ رہ سکے۔

ہمارے اسباب زوال دو قسم کے ہیں ایک خارجی جو غیر مسلم اقوام کے حرب و ضرب و تغلب و تسلط سے پیدا ہوئے۔ دوسرے داخلی جو خود ہماری بے راہ روی اور سیاسی غلطیوں کی وجہ سے پیش آئے ہیں انہی داخلی

اسباب سے بحث کروں گا کیونکہ ملت کے امراض کے اصلی باعث یہی ہیں۔ انھیں کی بدولت ہم کمزور ہو گئے جس کی وجہ سے دوسروں نے جو توانا اور قوی تر تھے ہمارے اوپر اپنا تسلط جما لیا۔ اگر ان اسباب کے دفعیہ کا سامان ہو جائے تو کمزوری خود بخود جاتی رہے گی۔

لہٰذا اصل نقطۂ بحث وہی امور ہیں جن کے باعث ہم انعاماتِ الٰہی کے مستحق نہ رہے اور کرم کی جو بارشیں ہمارے اسلاف پر ہوئی تھیں ان سے محروم کر دیئے گئے۔

اس لئے لازم ہے کہ آغازِ عہد سے ان کے اوپر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو سکے۔

اسلامی تعلیم کی اصل روح یہ ہے کہ انسانوں کا حاکم اکیلا اللہ ہے اور سب صرف اسی کے بندے ہیں۔ یہ عظیم الشان منتہائے نظر ہے جو قرآنی آیات میں جا بجا واضح کیا گیا ہے۔

ان الحکم الا للہ۔ امر الا تعبدوا الا ایاہ۔ (۱۲/۴۰)

کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم بجز اس کے کسی کے بندے نہ بنو۔

اسلام کی رُو سے ایک انسان دوسرے انسان پر یعنی ایک بھائی دوسرے بھائی پر حکمران نہیں ہو سکتا۔ ان معنوں میں کہ اپنی منفعت کے لئے اپنی منشاء کے مطابق اس پر حکومت کرے۔ بلکہ اسلامی امارت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے احکامِ الٰہی کی تنفیذ کی جائے اور بس۔ اللہ کے سوا اسلام کسی کو حاکم نہیں تسلیم کرتا۔

خلافتِ راشدہ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں جس طریق پر امت کو چلایا اس کے متعلق کچھ لکھنا ہی غیر ضروری ہے۔ وہ تو خالص پیغمبرانہ تعلیم اور مربیانہ تربیت تھی جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ آپ کا ۲۳ سالہ عہدِ نبوت گویا ۲۳ مونیوں کی مالا ہے جو زمانہ کی گردن میں پڑی ہوئی ہے۔ آپ کی صحبت کے فیض سے صحابہ کرامؓ نے خلافت کو انہی اصول پر قائم کیا۔ خلیفہ میں شاہانہ تمکنت اور جاہ و جلال حکومت کی کوئی شان نہ تھی۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی سڑکوں پر پیدل پھرتا تھا، نہ اس کے ساتھ محافظ ہوتے تھے نہ نقیب، سب لوگ اس سے ملتے تھے اور سب سے وہ ملتا تھا۔ اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں بجز عہدۂ خلافت کے اور کوئی امتیاز نہ تھا نہ اس کو اس قسم کی دینی ریاست حاصل تھی کہ جو چاہے حکم دیدے، وہی مذہبی مسئلہ ہو جائے بلکہ وہ صرف احکامِ دینی کو نافذ کرنے کا مجاز تھا۔

اس خلافت کا کل زمانہ تیس سال رہا۔ اس تیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو وہ سربلندی نصیب ہوئی کہ ترکستان سے بحرِ خزر تک اور افریقہ میں تونس تک اسلام پھیل گیا اور قوت اس قدر زبردست ہو گئی کہ روئے زمین پر کسی کو ان سے ٹکرانے کا یارا نہ رہا۔ یہ تمام آسمانی برکتیں اور فتوحات اور امارتِ اسلامیہ کی یہ عظمت و شان اس

سے تھی کہ سب اسلامی نظام میں منسلک اور اکیلے اللہ کے فرماں بردار تھے۔ خلیفہ کی ذات میں ان کی مرکزیت تھی جس کی وجہ سے ان کے ملی مقاصد متعین تھے اور ساری امت ایک محور پر گھومتی تھی۔

عہد بنی امیہ خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کا دور آیا جو اس دن سے شروع ہوا جس دن امیر معاویہؓ کی خلافت پر عام بیعت ہوئی یعنی ۴۱ھ۔ اس دور میں بھی جو پانوے سال رہا، امت ایک ہی جھنڈے کے نیچے رہی۔ ان خلفا کی ذات میں بھی امت کی مرکزیت قائم تھی، اور خواہ وہ کیسے ہی رہے ہوں، اسلامی قوت اور شوکت کو انھوں نے سنبھالا رکھا۔ بلکہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں تو فتوحات کے حدود مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک پہنچ گئے تھے اور بری فوجوں کے علاوہ ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی تھا جس نے سطح زمین پر کئی بار رومیوں کو شکستیں دی تھیں۔ دولت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں اہلِ انصاب راتوں کو اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر گھومتے تھے۔ مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

استبداد مگر باوجود ان خوبیوں کے مرض پیدا ہو چکا تھا یعنی استبداد، وہ استبداد جو اقوام دائم کے لئے ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اس کا پہلا مظہر خود ان کی خلافت تھی۔ خلفائے راشدین میں سے اگرچہ ہر ایک کی نوعیت انتخاب جداگانہ تھی مگر مشورہ اور بیعتِ عامہ یعنی جمہوریت کی روح ہر ایک میں موجود تھی لیکن امیر معاویہؓ جو خلافت بنی امیہ کے بانی ہیں ان کا انتخاب عام نہیں ہوا تھا۔ صرف اہلِ شام نے ان کو خلیفہ بنایا تھا اور اہلِ عراق نے امام حسنؓ کو منتخب کیا تھا۔ مگر جب امیر معاویہؓ نے ان پر لشکر کشی کی تو انھوں نے امت میں خونریزی کو ناپسند کر کے مصالحت کر لی۔ لہٰذا اہلِ عراق نے بھی امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مگر مغلوب ہو کر۔ اس وجہ سے ان کی خلافت میں تغلب شامل تھا۔ چنانچہ جب حضرت سعد بن وقاص فاتح قادسیہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں امیر معاویہؓ کے پاس آئے تو ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح بادشاہوں کو کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہ نے ہنسے اور کہا کہ اگر تم مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا بگڑ جاتا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جس طریق سے تم نے خلافت حاصل کی اگر مجھے ملتی تو میں کبھی اس کو قبول نہ کرتا۔

غرض اہلِ نظر اور ارباب حل خلافت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے جو خلفائے راشدینؓ کے عہد میں تھا۔ امیر معاویہؓ کا غلبہ اور تسلط سے اس کو حاصل کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تغلب رضامندی سے بدل گیا۔ کیونکہ امیر معاویہؓ کی خلافت کی قابلیت میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہ تھا لیکن انھوں نے خلیفہ کے انتخاب عام کے دستور ہی کو توڑ ڈالا اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا جس کے بعد سے خلفائے بنی امیہ سلسلہ وار اپنے ہی خاندان کے افراد میں سے جس کو چاہتے تھے ولی عہد بناتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی خلافت پر استبداد کا رنگ غالب رہا۔ اور ان کی حکومت خاندانی سلطنت ہو گئی۔ مگر چونکہ خلیفہ کا لفظ دینی اقتدار اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا اس لئے انھوں نے اس لقب کو

ترک نہیں کیا کیونکہ اس کے ذریعہ وہ لوگوں پر اپنا مذہبی اثر قائم رکھتے تھے۔ بیشک بنی امیہ کی حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عہد مستثنیٰ ہے جنھوں نے ان کے مظالم کو مٹا کر خلافت راشدہ کی شان قائم کر دی تھی مگر ان کا کل زمانہ صرف دو سال پانچ ماہ تھا۔

قہر و غلبہ بنی امیہ کے عہد میں قہر و غلبہ کی حکمرانی تھی۔ یہاں تک کہ عبدالملک نے جو ان کا چوتھا اور سب سے مدبر خلیفہ تھا صاف صاف کہدیا کہ تم لوگ یہ کیونکر خواہش رکھتے ہو کہ ہم شیخینؓ کے طریقہ سے تمہارے اوپر حکومت کریں۔ پہلے خود تو ویسے بنو جیسے ان کے زمانہ کے لوگ تھے۔ اس وجہ سے ان کی حکومت میں مظالم ہونے لگے جو اس استبداد میں لازمی ہیں۔ لوگ سختی کے ساتھ دبائے جانے لگے جس کی طرف سے مخالفت ہوتی اس کا سر کچلوا کر مشتہر کیا جاتا تاکہ دوسرے لوگ ڈر جائیں اور مخالفت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

خلفاء کے علاوہ ان کے بعض بعض عمال نے بھی آزاد طبع اور حریت پسند مسلمانوں کو جنھوں نے خلافت راشدہ کا عہد دیکھا تھا نہایت سختی کے ساتھ محکوم اور رعایا بنانا شروع کیا۔ زیاد اور اس کے بیٹے ابن زیاد کے مظالم مشہور ہیں۔ یہ صرف شبہ پر لوگوں کو گرفتار کر کے سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے۔ حجاج بن یوسف کوفہ کے عامل نے جس قدر آدمیوں کو قتل کیا مسعودی کے بیان کے مطابق ان کی تعداد سوا لاکھ سے کم نہ تھی۔

تفریق امت استبداد کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ ان کی حکومت رعایا کے فائدہ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ حکمران جماعت کے مقاصد کے لئے ہوتی ہے۔ یہ خلفاء اپنے مخصوص اغراض کے لئے ملت میں وحدت قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ جاہلانہ عصبیتوں کو ابھار کر ان کو ایک دوسرے کا دشمن رکھتے تھے تاکہ ضرورت پر ایک فریق سے دوسرے فریق کے مقابلہ میں کام لے سکیں۔ ان باہمی عداوتوں کی وجہ سے خود خلفاء کو بھی خطرہ رہتا تھا اس لئے وہ اپنے ساتھ محافظ دستے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی ان کے لئے مقصورے بنائے جاتے تھے اور جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دائیں بائیں دونوں طرف مسلح سپاہی حفاظت کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ حالانکہ خلفاء راشدینؓ عام لوگوں کی طرح بازاروں میں پھرتے تھے اور سب کے ساتھ مسجدوں میں جاتے تھے اور خود نماز پڑھاتے تھے۔

بیت المال سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خلفاء راشدینؓ عام افراد ملت کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ بیت المال کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور خود اپنے مال سے زیادہ اس کی حفاظت کرتے تھے۔ اس میں سوائے اس کے جو ان کے گزارہ کے لئے مقرر کر دیا جائے اپنی ذات کے واسطے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے۔ اس پر بھی کہا کرتے تھے کہ خلافت کی ذمہ داریوں سے قیامت کے دن اگر ہم بلا عذاب اور ثواب کے نکل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن خلفائے بنی امیہ شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے، بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے اور جس طرح چاہتے تھے اپنی منشاء کے مطابق اس کو صرف کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس کا اقتدار خزانہ پر ہوگا وہی ملک کے لوگوں پر اپنا اثر قائم کر سکتا ہے۔ یہ خلفاء مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے استبدادی اغراض پر صرف کر کے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ جو لوگ ان کے یہاں تنخواہیں پاتے تھے ان میں یہ جراءت باقی نہیں رہتی تھی کہ مخالفت کر سکیں جو نافرمانی پر آمادہ ہوتا اس کی تنخواہ بند کر دی جاتی چنانچہ یزید کے عہد میں اہلِ حرمین کی اور ولید کے زمانہ میں آلِ حرم کی تنخواہیں بند کی گئیں، انصار کے وظائف بارہا اس پر روک دیئے گئے کہ اہلِ بیت کی طرفداری کرتے ہیں۔

مدینہ کا عامل زکوٰۃ کی رقم قریش کے اعیان کو قرض پر دیتا تھا جس کی وجہ سے ان پر اپنا قابو رکھتا تھا جہاں کوئی مخالفانہ حرکت ان سے نمایاں ہوتی فوراً قرض کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنی امیہ کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

ہوسِ زر

خلافت راشدہ میں ممالک مفتوحہ سے محاصل اس لئے وصول کئے جاتے تھے کہ مجاہدین کی ضروریات رفع کی جائیں لیکن بنی امیہ کا نصب العین چونکہ اپنے گھر میں ایک مستقل سلطنت قائم کرنا تھا اس لئے ان کو ضرورت ہوئی کہ طاقتور قبائل و اشخاص پر اپنا اثر رکھیں۔ اس کی صورت سوائے اس کے اور کیا تھی کہ ان کے سامنے دولت پیش کریں چنانچہ انھوں نے بیت المال کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور جا و بیجا بے دریغ اس کی رقمیں صرف کرنے لگے۔ امراء و رؤساء قبائل کے علاوہ خطباء و شعراء کو بھی بڑی بڑی رقمیں زبان بندی کے لئے دی جاتی تھیں یہی وجہ ہوئی کہ محاصل کی وصولی میں ناجائز سختیاں بھی عمل میں آنے لگیں، یہاں تک کہ بعض صوبوں میں ذمیوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ان سے جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ افریقہ اور خاصکر خراسان میں اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے یہ کہکر کہ ہم مبلغ ہیں محصل نہیں ہیں اس خلافِ اسلام طریقہ کو بند کیا، جس کے بعد لاکھوں ترک حدود سمرقند میں جو اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے، پھر مسلمان ہو گئے۔

مالِ زکوٰۃ کو بھی جس کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں، یہ خلفاء اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرتے تھے یہ دیکھ کر عمالِ حکومت میں بھی دست درازی کی عادت ہو گئی۔ خلفاء بنی امیہ نے ایک مدِ تحصیل زر کی یہ بھی نکالی کہ عہدوں کو فروخت کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال ان کو اپنی زرخرید جائداد سمجھ کر رشوت، غبن اور جبر ہر طریق سے دولت پیدا کرنے لگے۔ خلفاء جب ان سے خفا ہوتے تو ان کو برطرف کر کے ان کی جائدادیں ضبط کر لیتے۔

الغرض شخصی اور استبدادی حکومت کی جو لازمی خرابیاں ہیں وہ خلافت بنی امیہ میں پیدا ہو چکی تھیں خلفاء بنی امیہ اگرچہ مسلمانوں کا مرکز تھے لیکن ان کی مرکزیت خلفائے راشدین کی طرح اخوت، مساوات اور جمہوریت کی مرکزیت نہ تھی، بلکہ انھوں نے ملّتِ اسلام کو جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں صرف اللہ کی غلام تھی، اپنا غلام بنا لیا تھا۔

بنی عباس بنی عباس جنھوں نے مخفی تبلیغوں سے بنی امیہ کی بغاوت کا بیج بویا اور پھر ان کے مقابلہ کے لئے لوگوں کو کھڑا کیا جب کامیاب ہو کر ۱۳۲ھ میں تختِ خلافت پر آ گئے تو انھوں نے بھی وہی استبداد قائم رکھا جو بنی امیہ کے عہد میں تھا۔ ان میں سے ابتدائی آٹھ خلفاء کا زمانہ جو تقریباً سو برس رہا قوت اور شوکت کا زمانہ تھا، انھوں نے شعائرِ اسلامی کا احترام رکھا، نمازیں بھی پڑھتے تھے، حج بھی کرتے تھے اور جہاد میں بھی حصہ لیتے تھے مگر باوجود اس کے ملک و ملت کو ہمیشہ کے لئے اپنا اور اپنی اولاد کا غلام رکھنا چاہتے تھے۔ ایک کے بجائے دو دو بلکہ تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے، اور ان عہد ناموں پر اللہ، رسول اور ملائکہ سب کو گواہ بناتے تھے تاکہ یہ جائداد کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جا سکے اور اب تک ساری ملتِ اسلامیہ انھیں کے استبداد کے شکنجوں میں رہے۔

خلفاء بنی امیہ کو تو جملہ امت کی مرکزیت بھی حاصل تھی، مگر بنی عباس کے قبضہ سے اندلس روزِ ازل سے خارج رہا جہاں بنی امیہ کے بقایا میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن معاویہ نے پہنچ کر اپنی سلطنت قائم کر لی جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد عظمت و شان کے لحاظ سے خلافت عباسیہ کی حریف ہو گئی۔ علاوہ بریں عہد بنی امیہ میں قوت کی حکمرانی تھی، کیونکہ ان کی سلطنت اپنی قوم عربوں کی عصبیت اور طاقت پر قائم تھی، مگر بنی عباس نے عجمیوں خاصکر خراسانیوں کی مدد سے سلطنت حاصل کی تھی، اس وجہ سے کوئی قومی طاقت ان کے پاس نہ تھی۔ ان کی خلافت بجز اس کے کہ خلیفہ عرب تھا اور زبان عربی تھی سرتاسر عجمی تھی اور ساری وزارتیں دارتیں بھی موالیوں کے ہاتھوں میں تھیں یہی وجہ ہوئی کہ بنی عباس کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خلافت کو ہمارے ہاتھوں سے نکال کر دوسروں کو نہ دیدیں۔ چنانچہ انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کے بالمقابل ترکوں کی بھی ایک فوج مرتب کی تاکہ توازن قائم رکھیں۔ مگر اس ترکی فوج نے خود خلفاء پر تغلب حاصل کر لیا جس کو چاہتے تھے خلیفہ بناتے تھے اور جس کو چاہتے تھے معزول بلکہ قتل کر دیتے تھے خلفاء کی اس بے بسی کے زمانہ میں نئی نئی اسلامی سلطنتیں ظہور پذیر ہونے لگیں جن کے غلبہ سے وہ بالکل بے دست و پا ہو گئے۔ دیالمہ اور سلاجقہ کے تسلط کے عہد میں جو صدیوں رہا ان خلفاء کا صرف مذہبی اثر رہ گیا تھا اور حکومت سلاطین کے ہاتھوں میں تھی۔ یہاں تک کہ ۲۹۷ھ میں افریقہ میں فاطمیہ نے اور اس کے بعد اندلس میں عبدالرحمٰن ناصر نے اپنی اپنی خلافتوں کا اعلان کر دیا جس سے دنیائے اسلام میں بیک وقت تین خلافتیں قائم ہو گئیں جو ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ اور وہ مرکزیت جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کی صلاح و فلاح کے لئے نصب فرمایا تھا، ان قریشی خانوادوں کی باہمی رقابت اور دنیاوی منافست سے بازیچۂ طفلاں بن گئی۔

خلافت کا مقصد یہ تھا کہ جملہ بنی نوعِ انسان صرف حکومتِ الٰہی کے فرماں بردار ہوں نہ کہ انسانوں کے لیکن خلفاء بنی امیہ و بنی عباس نے اس کو محض خاندانی سلطنت بنانے کی کوشش کی جس کا انجام وہی ہوا جو ہر ایسے دنیاوی کارگاہ

عمل کا ہوا کرتا ہے۔ امراء و ولایات نے جب خلفاء کی یہ خود غرضی دیکھی تو ان میں بھی اسی قسم کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ یکے بعد دیگرے خود مختار ہوتے گئے۔ خلفاء کا رسماً صرف اس قدر اثر رہ گیا تھا کہ یہ متغلبین تحفے اور ہدیئے بھیج کر ان سے اپنی اپنی حکومتوں کے فرمان لکھوا لیتے تھے۔ آخر ۶۵۶ھ میں یہ بے جان خلافت ہلاکو کے ہاتھوں غارت ہو گئی۔

خلفاء عثمانیہ بغداد کی عباسی خلافت کی تباہی کے بعد سلاطین مصر نے انہی بقائے بنی عباس میں سے ایک شخص کو مصر میں خلیفہ بنا لیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی حکومت کو مستحکم رکھیں۔ ان خلفاء کا عزل و نصب خود سلاطین مصر کے ہاتھوں میں تھا جن کے وظیفہ پر یہ گزر کرتے تھے۔ ۹۲۳ھ میں سلیم عثمانی نے مصر کو فتح کر کے خلافت بھی حاصل کر لی اور اس طرح اپنے دنیاوی وقار کے دستار میں دینی عزت کا بھی طرہ لگایا۔ لیکن خلفاء عثمانیہ بالطبع اپنے رتبہ سلطنت ہی کو جس کے ذریعہ سے انھوں نے خلافت حاصل کی تھی بالاتر سمجھتے رہے اور سوائے سلطان کے کبھی اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا پسند نہ کیا۔ علاوہ بریں ان کی خلافت بھی خلافت عامہ نہ تھی بلکہ ان کے رقبہ مقبوضہ تک محدود تھی اور انھوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور جزیرۃ العرب کے محافظ ہونے کے جو فتح مصر کے بعد ان کی سلطنت کا جزو ہو گیا تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا۔ یہاں تک کہ حج جس میں اقصائے عالم کے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اور جو اجتماع ملت کا دینی مرکز ہے۔ اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ بالآخر ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے اس خلافت کا بھی جو اتحاد ملت کا ایک بوسیدہ رشتہ اور بے معنی ادارہ رہ گیا تھا الغا کر دیا۔ جس کے بعد سے مسلمانوں کی مرکزی زندگی کا نام بھی جاتا رہا۔

موجودہ حالت آج امت اسلامیہ کی تعداد تمام عالم میں تقریباً ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی قوموں کی تعداد سے اگر زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں ہے مگر ان میں سے سوائے ترک، ایرانی، افغان اور عرب کے جن کی مجموعی تعداد چھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے بقیہ ساری امت غیر مسلم حکومتوں کے قبضہ میں ہے یعنی مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا زیادہ سے زیادہ صرف دسواں حصہ ہے جو آزاد کہا جا سکتا ہے۔ ان آزاد اقوام مسلمہ کا بھی کوئی ایک مرکز نہیں ہے بلکہ متعدد خود مختار سلطنتوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ عرب جس سے اسلام کا چشمہ ابلا تھا آج اس میں چھوٹی بڑی دس سلطنتیں ہیں جن میں سے کوئی کسی کے اثر میں ہے اور کوئی کسی کے۔ یہ سارا نتیجہ ہے امراء و سلاطین امت کی ان مطلق العنانیوں کا جن کی وجہ سے انھوں نے مرکزیت کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے ذاتی اغراض کے پیچھے ملت کے انجام پر نظر نہیں ڈالی۔

جو تحت میں دوسروں کی محکوم ہیں ان کا انتشار تو اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ان کے اعمال سے صلاحیت مفقود ہو گئی ہے ادھر کم سے کم دو سو سال کے کارناموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کوششوں اور قربانیوں کے بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکا۔ مراکش سے لے کر دیوار چین تک کتنے ہنگامے اٹھے اور کتنے مجاہدانہ معرکے ہوئے مگر ہر ایک

میں نقصان ہی اٹھانا پڑا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ امت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور کوئی مرکز نہیں ہے جو اس کی قیادت کرے تاکہ اس میں عمل صالح کی حرکت پیدا ہو۔

ہندوستان کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس کی حالت خود آپ کے سامنے ہے۔ یہاں تو لوکر وڑ کے قریب مسلمان آباد ہیں مگر اجتماعی زندگی کا نام تک نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم دن بدن ہر لحاظ سے گرتے ہی چلے جا رہے ہیں کوئی راہ نہیں۔ جس پر سب متفق ہو کر چلیں۔ کوئی کام نہیں جس کو سب مل کر کریں۔ جمود اور تعطل کی زندگی ہے۔ اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

ذہنی تشتت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے صرف ایک کتاب لیکر آئے تھے یعنی قرآن کریم جس پر عمل کر کے صحابہ کرام نے دینی اور دنیاوی سربلندی حاصل کی۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا عمل اسی کتاب پر رکھا اور امت کو اس سے ہٹنے نہ دیا جس کی وجہ سے ان کے زمانوں میں کوئی مذہبی فرقہ پیدا نہ ہو سکا اور ساری ملت متحد رہی۔

عہد بنی امیہ میں جب استبداد کا تسلط ہوا تو خلفا نے دنیا کو لے کر دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے حصہ میں آگئی۔ اسی وقت سے اختلافات پڑنے لگے اور شخصیت پرستی کی وجہ سے نت نئے فرقے بننے شروع ہو گئے۔ عباسی عہد میں فقہا میں اختلاف واقع ہوئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی ڈیاں الگ الگ ہونے لگیں۔ اسی زمانہ میں علوم عقلیہ کے تراجم ہوئے۔ اس وقت سے اختلافات روایات و تاویلات کے باعث یہ ذہنی تشتت اور بھی بڑھ گیا چنانچہ ایک ہی ملت میں تہتر فرقے بن گئے جن میں سے ہر ایک اپنے ہی کو ناجی سمجھنے لگا اور دوسروں کو ناری۔ اس طرح پر ملت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے امت اسلامیہ کو دو عظیم الشان نعمتیں ملی تھیں۔ ایک قرآن کریم دوسری امت کبریٰ یعنی مرکزیت امت جس کو آپ نے نصب فرمایا تھا۔ ملوکیت نے مرکزیت کو فنا کر دیا اور شخصیت پرستی نے قرآن متروک و مہجور کر دیا جس سے دنیاوی اور دینی دونوں لحاظ سے امت میں لامرکزیت پیدا ہو گئی اور یہی زوال کا باعث ہوئی۔

مستقبل امت کی آئندہ صلاح و فلاح کی صورت صرف یہی ہے کہ لامرکزیت چھوڑ کر وحدت کی طرف آئے یعنی رفتہ رفتہ مسلمانوں کا مرکز ایک ہو جائے، جہاں سے ملت کے اجتماعی مقاصد کی تعیین اور ان کو عمل میں لانے کی تشکیل ہو اور دینی مرکز قرآن کریم ہو تاکہ ہر قسم کی فرقہ بندی مٹ جائے اور سب کے سب متحد ہو کر ایک راستہ پر گامزن ہوں۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد مسلم اقوام نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور ان کے پیش نظر نہ صرف ملت کا اتحاد عمل ہے بلکہ مرکزیت کا نصب کرنا بھی مقصود ہے۔ اس لئے امید ہوتی ہے کہ شاید ان عروق مردہ میں پھر زندگی کا خون دوڑنے لگے اور ساری امیدیں تو اللہ کے رحم اور کرم سے ہیں جو افراد کی طرح ملت کے گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

اسلام پر یونانی اور رومی تہذیب کے اثرات

(۲)

(علامہ احمد امین مصری (مرحوم))

(گزشتہ اشاعت سے مسلسل)

یونانی تہذیب و ثقافت کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑا۔ اس کا اثر یوں اور بھی زیادہ ہو گیا کہ اس تہذیب کے ساتھ مسلمانوں کو لگاؤ اس وقت ہوا جب عربی علوم کی تدوین کی جا رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی ثقافت تمام علوم میں سرایت کر گئی اور اس نے انہیں ایک خاص رنگ میں رنگ دیا۔ اس ثقافت کا اثر شکل و صورت اور موضوع دونوں اعتبار سے بڑا گہرا تھا۔

شکل و صورت میں

جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے، اس کے اثرات یونانی منطق کی شکل میں ظاہر ہوئے اس نے تمام عربی علوم کو ایک نئے رنگ میں رنگا جو اس کے قالب میں ڈھالے گئے اور اسی کے طریقہ پر وضع ہوئے۔ کیونکہ منطق (جیسا کہ ابن سینا نے کہا ہے "علوم کی خادم" تھی مسلمانوں کا جیسے ہی فلسفہ سے سابقہ پڑا، اول وہلہ سے انہوں نے منطق پر توجہ دی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابن المقفع نے ارسطو کی منطقی کتابوں کے ترجمے کئے تھے۔ اور ان کے بعد سے تمام مترجم منطق کی کتابوں کا ترجمہ کرتے رہے۔ جو منطق عربوں تک پہنچی تھی وہ ارسطو کی منطق تھی جس میں کافی حد تک تعدیل کر دی گئی تھی اور اضافے ہو چکے تھے۔ اس کی شرح رواقی اور اسکندرانی اسکول کے مطابق کی گئی تھی۔ عربوں نے اس میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کیا۔ ساری منطق جو ہم تک پہنچی ہے وہ یونان ہی کی منطق ہے، اس پر بجز اس کے کوئی اضافہ نہیں ہوا کہ اس کی شرحیں وغیرہ لکھی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فن بالکل صحیح طریقہ پر عربی زبان میں منتقل ہوا جس میں کسی نقص یا آمیزش نے دخل نہیں پایا جیسا کہ یونانی الٰہیات کے سلسلے میں ہوا ہے

ارسطو کی کتب منطق اور ان کی عربی شرح میں جو اس زمانہ میں لکھی گئیں، آج کی منطق کی کتابوں کی نسبت جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں اپنے اندر زیادہ وسعت اور گہرائی رکھتی تھیں۔ چنانچہ ان کتابوں میں قیاس کی بحث کتابوں کے بڑے حصہ پر محیط ہوتی تھی۔ برہان کے سلسلہ میں اس میں ایک بڑا وسیع باب ہوتا تھا۔ مناظرہ کے سلسلے میں ایک الگ باب ہوا کرتا تھا کہ وہ کیسے ہوتا ہے اور مقابل کو کس طرح ساکت کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک باب سفسطہ کا، ایک باب خطابت کا اور ایک باب شعر کا بھی ہوا کرتا تھا۔ اور ان پانچوں آخری ابواب یعنی برہان، مناظرہ، خطابت، شعر اور سفسطہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی جاتی تھی[۱]۔ لیکن متاخرین نے ان ابواب کو حذف کر دیا یا ان کے متعلق بہت ہی مختصر بحث کرنے پر اکتفا کیا۔ انھوں نے کلیات خمسہ اور قضایا اور قیاس کی مختصر بحث پر اسے ختم کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے حذف کر دیا وہ اس سے کہیں زیادہ اہم تھا جو انھوں نے باقی چھوڑ دیا ہے[۲]۔

بہرحال عباسی عہد میں لوگوں کی عقلوں پر منطق کا بڑا ہی تسلط تھا اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مناظرہ، بحث، تعبیر اور تدلیل کے طریقہ نے وہ رنگ اختیار کر لیا جو اس رنگ سے قطعاً مختلف تھا جو اس سے پہلے معروف تھا۔ چنانچہ اگر آپ قرآن کریم کے اسلوب بیان اور متکلمین کے اسلوب بیان میں موازنہ کرنے لگیں تو آپ کو بڑا ہی فرق نظر آئے گا جسے اگر مختصر ترین الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو آپ یہی کہیں گے کہ متکلمین کے اسلوب ہائے بیان ارسطو کی منطق کے اسلوبوں پر پورے اترتے ہیں جبکہ قرآن کا اسلوب بیان قطعاً ایسا نہیں ہے۔ محمد بن ابراہیم حسنی یمنی صنعانی نے اپنی کتاب "ترجیح اسالیب القرآن علی اسالیب الیونان" اسی موضوع پر لکھی ہے اور بالکل صحیح لکھی ہے[۳]۔ چنانچہ وجود باری تعالیٰ کے اثبات میں قرآن کریم کا اسلوب تو یہ ہے کہ

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ؟ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ
وَالْأَبْصَارَ؟ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ؟
وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ؟ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ!

اے پیغمبرِ اسلام! آپ ان سے پوچھئے کہ آسمان اور زمین سے تمھیں کون رزق دیتا ہے؟ یا تمہاری سماعت اور بصارت کس کے قبضۂ قدرت میں ہے؟ زندہ کو مردہ چیز سے اور مردہ چیز کو زندہ سے کون نکالتا ہے؟ تدبیرِ امور کون کرتا ہے؟ اس کے جواب میں وہ سب

---

[۱] اس سلسلہ میں انگریزی زبان میں ارسطو کی منطق کو ملاحظہ کیجئے۔ پہلے عربوں نے ارسطو کے یونانی شارحین کی پیروی کی تھی اور خطابت اور شعر کا اس پر اضافہ کر دیا تھا۔ [۲] ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون ص ۴۱۲ [۳] یہ کتاب مصر میں مطبع معاہد میں طبع ہو چکی

یہی کہیں گے کہ یہ سب کام تو خدا ہی کرتا ہے۔

یا مثلاً حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَھُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰھَا وَزَیَّنّٰھَا وَمَا لَھَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰھَا وَاَلْقَیْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍۢ بَھِیْجٍ ۝ تَبْصِرَۃً وَّذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۝ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَکًا فَاَنْۢبَتْنَا بِہٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّھَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ ۝ (پ ۲۶)

کیا انھوں نے آسمان پر غور نہیں کیا جو ان کے سروں پر موجود ہے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے اور کس طرح اسے آراستہ کیا ہے کہ اس میں کہیں شگاف بھی نہیں ہیں۔ اور زمین کو ہم نے کس طرح پھیلا دیا ہے اور اس پر بڑے بڑے مضبوط پہاڑ ڈال دیئے ہیں اور پھر اس میں ہر قسم کی جوڑ جوڑ خوشنما چیزیں اگا دیں۔ یہ باتیں ہم اس لئے بیان کرتے ہیں کہ خدا کی طرف رجوع ہونے والے بندوں کو بصیرت اور نصیحت حاصل ہو۔ اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کر کے اس سے باغات اور اناج کے کھیت اگا دیئے جو کاٹے جاتے ہیں اور لمبی لمبی کھجوریں پیدا کر دیں جن میں خوب گتھے ہوئے خوشے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم کا اسلوب بیان یہی ہے۔ اس میں اس قسم کی بے شمار آیات ہیں لیکن متکلمین کا اسلوب بیان یہ نہیں ہے وہ اس طرح بات کرتے ہیں کہ مثلاً "دنیا حادث ہے اور ہر حادث ہونے والی چیز کا کوئی پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ لہٰذا دنیا کا پیدا کرنے والا بھی ضرور کوئی ہوگا"۔ ان کے ہاں اسی قسم کے دلائل ہوتے ہیں۔ پھر اس ذیل میں ان کے ہاں جوہر، عرض، کیفیت، کمیت، علم بدیہی، علم نظری، وغیرہ قسم کی اصطلاحات بھی ہر بات میں ملتی ہیں جو خالص یونانی فلسفہ کی تعبیرات ہیں۔

خلفائے راشدینؓ اور بنو امیہ کے عہد کے فقہاء کی تعبیرات اور عباسی عہد کے فقہا کی تعبیرات میں ——— جبکہ وہ منطق سے واقف ہو چکے تھے ——— اگر آپ موازنہ کریں تو بعینہٖ یہی حال آپ کو وہاں بھی ملے گا۔ خلفاء راشدینؓ اور اموی عہد کے فقہا کی تعبیرات خالص عربی انداز کی ملیں گی اور عباسی عہد کے فقہا کی تعبیرات خالص ارسطاطالیسی انداز کی ہوں گی۔ مثال کے طور پر آپ مؤطا امام مالک کا کوئی باب پڑھ جایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ ایک حکم بیان کرتے ہیں اس کے بعد وہ حدیث یا اثر بیان کرتے ہیں جو اس حکم پر دلالت کرتا ہو۔ اس میں آپ کو علم منطق کا کوئی

اثر نہیں ملے گا۔ اس کے بالمقابل کتاب ہدایہ میں کسی تدلیل فقہی کو پڑھ کر دیکھیے خصوصیت کے ساتھ ان اختلافی مسائل میں جو مثلاً امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے مابین نزاعی رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ مناظرہ کے ان تمام قوانین کی پیروی ہو رہی ہوگی جو ارسطو نے اس سلسلے میں وضع کئے ہیں اور پوری باریکی کے ساتھ برہان و قیاس کے تمام قواعد کو وہاں منطبق کیا گیا ہوگا۔ ایک مقدمہ صغریٰ ہوگا۔ دوسرا مقدمہ کبریٰ ہوگا اور پھر نتیجہ نکالا جائے گا۔ قیاس کی شکلوں میں تمام شرائط کی پوری پوری پابندی کی گئی ہوگی۔

آپ سیبویہ کی کتاب ملاحظہ فرمایئے تو آپ اس میں منطقی ترتیب اور تبویب موجود پائیں گے۔ وہ سب سے پہلے کلمہ کی تقسیم کرتے ہیں کہ وہ اسم، فعل اور حرف ہوتا ہے پھر وہ ہر قسم کی تعریف بیان کرتے ہیں اور سب کی مثالیں دیتے ہیں اور ان کے احکام بیان کرتے ہیں۔ آخر تک آپ یہی انداز پائیں گے۔ پھر آپ یہ بھی دیکھیے کہ ارسطو نے کہا تھا کہ "زمان و مکان' اشیاء کے لئے برتن کی طرح ہوتے ہیں کیونکہ ہر پیدا شدہ چیز کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زمانوں میں سے کسی زمانہ میں اور مکانات میں سے کسی نہ کسی مکان میں واقع ہو۔ لہذا زمان و مکان اس چیز کے لئے برتن کی طرح ہوتے ہیں۔" یہ وہ بنیاد ہے جس کی بنا پر ہمارے علمائے نحو نے "مفعول فیہ" کا نام ہی "ظرف" رکھ دیا ہے یعنی برتن۔ پھر چونکہ ایساغوجی نے منطق میں ایک مختصر سا رسالہ مقدمہ یا مدخل کے نام سے تصنیف کیا تھا اس لئے ابن فارس نے بھی مقدمہ کے نام سے علم نحو میں ایک رسالہ تصنیف کر دیا۔

قیاس، جو ارسطو کی منطق کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل تھا اس کی رعایت اکثر علوم میں کی گئی ہے اور بڑی باریکی کے ساتھ اسے منطبق کیا گیا ہے چنانچہ قیاس فقہ میں بھی ہے اور اصول فقہ میں بھی۔ یہی قیاس نحو میں بھی ہے اور لغت میں بھی۔ یہی قیاس فلسفہ میں بھی ہے اور مسائل کی تفریع و تنویع میں بھی اس قیاس کا بڑا ہی دخل ہے۔ ایک قاعدہ کلیہ بنا لیا جاتا ہے اور پھر اس کے ماتحت ملتے جلتے مسائل رکھے جاتے ہیں۔ اور جہاں کوئی منقول حکم نہیں ملتا وہاں بھی اس کلیہ قاعدہ کو جاری کیا جاتا ہے۔ فقہ، نحو اور لغت سب میں آپ کو یہی انداز ملے گا۔ ان ہی باتوں کا اثر ہے کہ ہر علم کافی ضخیم ہو گیا ہے اور اس کی ترتیب و تبویب بھی منطقی ہو گئی ہے[۱]۔

---

[۱] مضامین پروفیسر جویدی ص ۔ نحو میں جو قیاس ہوتا ہے اس پر ہم آگے بحث کریں گے۔ جہاں تک نحو کے قیاس کا تعلق ہے اس کی انھوں نے یہ تعریف کی ہے کہ "کسی فرع کو کسی اصل پر محمول کر لینے کو قیاس کہتے ہیں کیونکہ دونوں میں علت مشترک ہوتی ہے۔" فقہی تعریف بھی اسی کے قریب قریب ہوگی۔ نحویوں نے بھی اسے اسی طرح منطبق کیا ہے جیسے فقہا نے منطبق کیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ فلاں لفظ فعل کے ساتھ آیا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

موضوع میں کچھ تو محض شکل و صورت کے متعلق تھا۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ متکلمین کی تعلیمات میں یونانی فلسفہ کا بڑا اثر ہے۔ معتزلہ پر جب ہم بحث کریں گے تو وہاں ان اثرات کو بیان کیا جائے گا۔ افلاطونیت جدیدہ کا کچھ اثر ہمیں تصوف میں ملتا ہے جسے ہم تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے واضح کریں گے۔ اور ان دونوں کے وسیع اثرات ہمیں اسلامی فلسفہ میں ملتے ہیں مگر یہ بحث اسلامی فلسفہ کی تاریخ کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اسی طرح یونانی بلاغت کے اثرات بھی عربی کے علم البلاغت میں کافی ملتے ہیں مگر عربی علم البلاغت کی تدوین اس عہد کے بعد ہوئی ہے جس کی تاریخ ہم یہاں بیان کر رہے ہیں لہٰذا ہم اسے یہاں نہیں چھیڑیں گے۔

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربوں یا مسلمانوں نے یونانی ثقافت سے جو کچھ بھی لیا انھوں نے اس سے نہایت عمدہ اور جائز کام لیا۔ جو کچھ انھوں نے یونانیوں نے لیا وہ لے لیا مگر اس کے بعد اس کی بنیاد پر انھوں نے تعمیریں اٹھائیں۔ اس میں اضافے کئے اور اپنی طرف سے اختراعات کیں۔ ان کا موقف محض ایک نقال کا موقف نہیں تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ایسے تھے جو ایک آنکھ سے یونانی ثقافت کو دیکھتے تھے اور دوسری آنکھ سے اسلامی تعلیمات اور عربی ثقافت کو بھی دیکھتے تھے۔ لہٰذا یونانی ثقافت سے وہ وہی چیزیں قبول کرتے

(ص کا باقی حاشیہ) مگر قیاس اس میں یہ تھا کہ کسرہ ہوتا۔ جب کوئی مسئلہ وہ کسی عربی آدمی سے نقل کرتے ہیں تو پھر اس پر قیاس کرنے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے ابن الانباری نے لکھدیا ہے کہ "نحویں علم قیاس کا انکار کسی طرح درست نہیں کیونکہ نحو تو ساری کی ساری قیاس ہی ہے۔ لہٰذا جو قیاس کا انکار کرتا ہے وہ نحو ہی کا انکار کرتا ہے"۔ مسائل کے سرچشمہ کو وہ دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک سماع اور دوسرے قیاس۔ سماع سے مراد تو وہ مسائل ہیں جو انھوں نے عربوں سے سنے ہیں اور قیاس سے مراد وہ مسائل ہیں جو انھوں نے سنے ہوئے مسائل پر قیاس کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بصرہ کے نحوی کوفہ کے نحویوں سے زیادہ صحیح القیاس ہوتے تھے کیونکہ بصرہ کے نحوی ہر سنی ہوئی بات پر توجہ نہیں کہتے تھے اور نہ ہی شاذ چیزوں پر قیاس کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوفہ کے نحوی بہ نسبت بصرہ کے نحویوں کے زیادہ وسعت کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ وہ شاذ چیزوں پر بھی قیاس کر لیتے تھے۔ اندلسی نے کہا ہے کہ کوفہ کے نحوی اگر کوئی ایک شعر بھی سن لیتے تھے جس سے کسی ایسی بات کا جواز نکلتا ہو جو اصول کے خلاف ہو تو وہ اسے الگ اور مستقل قانون بنا لیتے تھے اور بصرہ کے نحویوں کے برعکس اس کی تبویب شروع کر دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہو کتاب الانصاف فی مسائل الخلاف" کا مقدمہ)

تھے جو عربی ثقافت سے میل کھاتی ہوں۔ وہ ان دونوں کو ملا کر ایک معجون بناتے تھے جو نہ خالص یونانی ہوتی تھی اور نہ خالص اسلامی۔ اس کا زیادہ مظاہرہ عباسی دَور کے دوسرے حصہ میں ہوا جو اس عباسی دور سے متصل تھا جس کی تاریخ ہم یہاں بیان کر رہے ہیں کیونکہ اس دوسرے دور میں ترجمہ کا کام مکمل ہو چکا تھا اور وہ راسخ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس کو قبول کرنے اور اس پر تعمیر کرنے کا موقعہ تھا۔ اس دَور میں اخوان الصفا کا گروہ اور فارابیؔ ابن سینا اور ابن رشد جیسے حضرات پیدا ہوئے۔

بقیہ "لمعات" صفحہ ۸ سے آگے علم و حقیقت پر نہیں۔ (دیکھئے ۹/۱۴۹ ؛ ۱۶/۳۵ ؛ ۴۳/۲۲-۲۰)۔

قرآن کریم غلط نظام قائم کرنے والوں کو مجرم قرار دیتا ہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ، ان محکوموں کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیتا جو اس قسم کے نظام کے تابع، "صبر شکر کر کے" زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تمہارا، غلط نظام پر رضامند ہو کر بیٹھ رہنا، اس نظام کے استحکام کا باعث تھا۔ تم نے اس کے بدلنے کے لئے جد و جہد کیوں نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس قسم کے بالادست اور زیر دست دونوں طبقوں کو جہنم میں دکھاتا ہے اور ان کے باہمی مکالمے پیش کرتا ہے جن میں وہ ایک دوسرے کو ملزم قرار دیتے ہیں (مثلاً ۳۴/۳۱-۳۳)

ہر ذی ہوش انسان پہلے فیصلہ کرتا ہے اور اس کے بعد قدم اٹھاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم انسان کے فیصلے کو اس کی ذمہ داری کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ کسی بات کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے پاس صحیح معلومات ہوں اور وہ ان معلومات پر غور و فکر کے بعد فیصلہ پر پہنچے۔ اس لئے وہ کسی فرد کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کے فیصلوں پر آنکھیں بند کر کے چلتا جائے اور یوں اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لے۔ وہ ہر فرد سے تاکیداً کہتا ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ‎(۱۷/۳۶)۔ جس بات کا تجھے علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو۔ کان۔ آنکھ اور دل سب سے اس بات کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم ہر فرد کو ذاتی تحقیق کی کس قدر تاکید کرتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ اسے، اس کے فیصلے کا ذاتی ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، انسان نے اس عظیم ذمہ داری سے بچنے کے لئے، جو راہ فرار اختیار کی وہ اسلاف پرستی کا عقیدہ تھا۔ طلوع اسلام کی اسی اشاعت میں، "دین خداوندی کے مخالفین" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہو رہا ہے۔ آپ اس میں دیکھئے کہ قرآن کریم اس مسلک کی کس شدت سے مخالفت کرتا ہے جس کی رُو سے، انسان اپنے کسی فیصلہ یا عمل کے لئے، اسلاف کے اقوال یا اعمال کو بطور سند پیش کر کے، اپنی ذمہ داری سے گریز کی راہ اختیار کرتا ہے۔ وہ ہر فرد، ہر نسل اور ہر زمانہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ وہ اپنے لئے آپ فیصلہ کرے اور گذشتہ نسلوں کے فیصلے کو بطور سند اور دلیل پیش

کرکے "اپنی ذمہ داری سے جی چرانے کی ناکام کوشش نہ کرے۔ وہ اسلاف کے متعلق واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ۔ یہ ایک جماعت تھی جو اپنا وقت پورا کرکے دنیا سے چلی گئی۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ۔ جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے تھا۔ جو کچھ تم کروگے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے عمل اور فیصلہ کے ذمہ دار تھے۔ تم اپنے عمل اور فیصلے کے ذمہ دار ہو۔ تم یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ ہم نے اسلاف کے فیصلے کے مطابق عمل کیا ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ جس فیصلے کے مطابق تم نے عمل کیا ہے اس کے صحیح ہونے کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے۔ وہ اہلِ جہنم کے اس عذر کو قابلِ قبول قرار نہیں دیتا کہ رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (۳۳/۶۷)۔ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی اور انہوں نے ہمیں صحیح راستہ سے گمراہ کر دیا تھا۔ اس لئے ہماری گمراہی کے ذمہ دار وہ ہیں۔ ہم نہیں۔

جب ہم نے کہا ہے کہ قرآن کریم ہر نسل اور ہر زمانہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے لئے آپ فیصلہ کرے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ جو کچھ سابقہ نسلوں اور زمانوں سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اسے کالعدم قرار دیکر ہر دور، ہر بات کو از سرِ نو، نقطۂ آغاز سے شروع کرے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، ہر دور اس کا جائزہ لے اور اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھے کہ وہ اس پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ یہ ہے وہ ذمہ داری جو قرآن کی رُو سے ہر نسل اور ہر زمانے پر عائد ہوتی ہے۔

آپ قرآن کریم کی تعلیم پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ وہ کس طرح ان تمام معتقدات اور نظریات کی ایک ایک کرکے تردید کرتا ہے جن کی رُو سے انسان اپنی ذمہ داری سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس تعلیم کو سامنے رکھئے اور پھر اس تاسف انگیز حقیقت پر نگاہ ڈالئے کہ ہم نے کس طرح ان تمام معتقدات و نظریات کو ایک ایک کرکے اپنا رکھا ہے جن کے خلاف قرآن کریم کھلا ہوا چیلنج تھا! کیا اس اسلام کو حقیقی اسلام سے کچھ بھی نسبت ہے؟

ترسیلِ زر اور جملہ خط و کتابت کے وقت

اپنا پتہ صاف اور خوش خط لکھئے۔ اور خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے